کے تراجم کا ترتیب کے ساتھ ذکر ہے، ابتدائی دور کے ترجمون پر مختصر تبصرہ اور بعض کے نمونے بھی دیدئے ہین، مختلف فہرستون خصوصاً سجاد مرزا بیگ کی الفہرست مین کافی ترجمون کا ذکر ہے لیکن اس استیعاب کے ساتھ یہ پہلی کوشش ہے، اور بڑی حد تک کامیاب ہے، یہ موضوع ایسا ہے، کہ ممکن ہے کچھ ترجمے مرتب کے علم میں نہ آسکے ہون، جن کے اندراج کی بعد مین گنجایش باقی ہے؛ کتاب کے شروع مین ایک مختصر اور مفید مقدمہ بھی ہے،

تقویم ہجری وعیسوی مرتبہ جناب ابوالنصر محمد خالدی صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۵۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی،

تاریخ اسلام پر کام کرنے والون نے ہمیشہ ایسی تقویم کی ضرورت محسوس کی جس سے عیسوی اور ہجری سنہ کی مطابقت معلوم ہو سکے، عربی مین تو ایک سے زیادہ ایسی تقویمین ہین، ان مین سب سے بہتر حسن وفقی بک دمشقی کی تقویم المنہاج القویم ہے، اس مین سنہ عیسوی اور ہجری قمری سنہ کے ساتھ ہجری شمسی بھی بنا کر دیدیا ہے، لیکن اردو مین اس قسم کی کوئی تقویم موجود نہ تھی؛ مرتب نے اس تقویم کو مرتب کرکے کام کرنے والون کے لئے بڑی آسانی پیدا کردی، اس سے سنہ مطابق ۶۶۲ء سے ۱۵۰۰ھ مطابق ۲۰۷۶ء تک سنہ مہینہ اور دن تاریخ کی مطابقت معلوم ہو سکتی ہے،

حیاتِ جاوید مولینا حالی مرحوم تقطیع بڑی ضخامت ۲ حصے تقریباً ۹۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۴؍ پتہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی،

مولینا حالی کی مشہور تصنیف حیاتِ جاوید اپنی شہرت کی وجہ سے تعارف سے مستغنی ہے، جو اب غالباً کمیاب تھی، اس لئے انجمن ترقی اردو نے اسے اسی اہتمام سے چھاپا ہے، جسے اسکی ضرورت ہو وہ انجمن ترقی اردو سے منگا سکتا ہے،

"م"

"جلد ۴۵" ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۰ء "عدد ۶"

مضامین

شذرات

مولانا شبلی مرحوم کو پیشین گوئیوں کا دعویٰ نہ تھا، مگر ان کے نثر و نظم کلام میں اتنی پیشین گوئیاں ہیں کہ ان کو جمع کیا جائے تو ان کی خاصی تعداد ہو جائے، یورپ کے ملکون کی طرف اشارہ کرکے وہ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ ایک وقت آئیگا جب یہ شیشے خود ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے، تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ،

دنیا کی قوموں کے حالات نگاہ کے سامنے رکھنے سے یہ بات کتنی صاف نظر آتی ہے کہ ہر قوم کو دنیا مین اپنے وجود کے قائم رکھنے کے لئے کتنی جد و جہد، کتنی محنت، اور کتنے صرفِ جان و مال کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ راز قرآن پاک کے ہر صفحہ مین نمایان ہے، يُجَاهِدُوْنَ بِاَنْفُسِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ اور اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ وغیرہ سینکڑون آیتین مین جو بتاتی مین کہ نفس اور مال کا مجاہدہ کامیابی کی پہلی شرط ہے، جس قوم نے اس شرط کو پورا کیا وہی کامیابی کے میدان مین سب سے آگے نکلی،

مین نے ایک دفعہ ۱۹۲۶ء مین خلافت کانفرنس دہلی کے صدارت نامہ مین جو جامع مسجد دہلی اور لال قلعہ کے درمیان والے میدان مین منعقد ہوئی تھی یہ کہا تھا کہ اگر شاہجہان کی طرح لال قلعہ کے تخت طاؤس پر

بیٹھنے کی ہوس ہے تو پہلے بابر کی طرح بارہ برس ترکستان و افغانستان کے پہاڑون سے سر ٹکراؤ، بدر و حنین کے بغیر فتوحات فاروقی سے لطف اٹھانے کا خیال خواب شیرین سے زیادہ نہین،

دنیا تو جدھر جا رہی ہے جا رہی ہے، سوال یہ ہے کہ مسلمان عیش و آرام کے بستر پر اوج و اقبال کی چوٹی پر چڑھنے کا جو خواب دیکھ رہے ہین وہ کہان تک پورا ہو سکتا ہے، تغافل کی سرمستی، جان و مال کا بخل، عزم و ہمت کا فقدان اور زندگی کے مقصدِ اعلیٰ سے محرومی ہماری ساری ظاہری جد و جہد کو ناکام بنا رہی ہے، ظاہر مین نظر آتا ہے کہ ہم دوڑ رہے ہیں، حالانکہ ہم اپنی جگہ کھڑے ہیں، اور سمجھ رہے ہیں کہ دوڑ رہے ہین کیونکہ ہم دوڑ کی گفتگو اور دوڑ کی سمت متعین کرنے میں پوری طرح مصروف ہیں،

سب جانتے ہیں کہ اسلام نے فنون لطیفہ کی ہمت افزائی نہیں کی ہے، اس پر کتنے بے خبرون نے یہ کہا ہے کہ اسلام فنون لطیفہ کا دشمن ہے، اس نے زندگی کے تکلفات، تصاویر اور عریان شہوانی جذبات کی شاعری کو ناپسند کیا ہے، لیکن اس مسئلہ کو اس حقیقت کی نظر سے دیکھئے کہ یہ اس قوم کا نظریہ ہے جو جد و جہد اور سعیِ پیہم کے فلسفہ پر ایمان رکھتی ہے، اور جو حسنِ نظر اور تماشائے منظر کی دلدادہ نہیں، اور فنونِ لطیفہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قوموں کے جسمانی جد و جہد اور قلبی طمانیت و سکون کے بجائے ذہنی تعیش، اور عقلی لطف انگیزی کے زمانہ میں ترقی پاتی ہے، کسی قوم مین ان کا عروج اس کے دوڑ دھوپ کے عہد کی نہیں بلکہ اس کے توقف اور سیر و تفریح کے عہد کی علامت ہے، اسلئے فنون لطیفہ اور ان کی ترقی کے لئے ساری محنت اور جان و مال کا صرف قوم کی صحت مزاج کی نہیں بلکہ بیماری کی نشانی ہے،

زندگی **قوت** کا نام ہے، جو قوم قوت سے محروم ہے وہ زندگی سے محروم ہے، اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (دشمنون سے مقابلہ کیلئے جو قوت تم سے ہو سکے وہ تیار رکھو) کا قرآنی فلسفہ اسی تعلیم کی طرف اشارہ کرتا ہے

اگلے مفسرین نے اپنے زمانہ کی حالت کے مطابق قوۃ کی تفسیر تیر اندازی کی مشق سے کی تھی مگر قوۃ کی تشریح زمانہ کی حالت کے لحاظ سے بدلتی رہیگی، اور قرآن پاک کے لفظ کا عموم اپنی وسعت کے دامن میں ہر اس چیز کو سمیٹتا رہیگا، جس سے دشمنوں کی طاقت کا مقابلہ کیا جا سکے،

دوسرے اسلامی ملکوں کو چھوڑ کر صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے سارے مراتب کو پیش نظر رکھئے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے جیسے جیسے مجاہدانہ طور و طریق کو چھوڑ کر عیش و راحت کی زندگی کے خوگر ہونا شروع کیا، ہر میدان سے ان کا قدم ہٹتا گیا، اور بالآخر عیش و راحت کا وہ سامان بھی ان سے چھن گیا جس کے حصول کے لئے وہ اپنا دین و دنیا سب کچھ قربان کر رہے تھے،

ہم آج دوسری سربلند قوموں کی نقالی بھی کرتے ہیں تو ان کے عیوب اور برائیوں میں کرتے ہیں، حالانکہ ہم اگر ان کی نقالی ہی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ہنر اور محاسن میں کریں، ہم شراب خواری، قمار بازی، سود خواری، فیشن بازی، بے پردگی اور الحاد و بیدینی میں تقلید کرتے ہیں اور انھیں چیزوں کو ان کی قوت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کی قوت کا سرچشمہ ان کی جدوجہد سعی و محنت، ایثار و قربانی، انفاق مال اور حق کی خاطر ہر مصیبت کے جھیلنے کا ذوق ہے،

بنی اسرائیل کو ایک بادشاہ کی تلاش تھی، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انتخاب کی دو شرطیں بتائیں بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (علم اور جسم میں طاقت) فلسفۂ تاریخ اور نفسیات اجتماعی کی ہر تحقیق اس نتیجہ کو ظاہر کرے گی کہ یہ دو طاقتیں ہر طاقت کی جڑ ہیں، اور شاہانہ اقتدار کی اصل بنیاد، علم گو ہر بیچے علم کو شامل ہی مگر سب سے بڑا علم **ایمان** ہے، ایمان کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، یعنی چند غیر متزلزل حقیقتوں کا اقرار اور جماعتوں کا اعتقاد جازم، اور اس اعتقاد جازم کے مطابق عمل، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، ذرا غور تو کیجئے کہ آج مسلمانوں کے اندر ان کا کوئی متحدہ اعتقاد جازم باقی ہے اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ ان میں پیدا ہے،

مقالات

جمالیاتی ارتقاء اور برہانِ ربوبیت

از

مولانا حکیم ابو النظر امروہوی

عصمتِ انبیا کا نظریہ، مذہب کا بنیادی پتھر اور ایک ایسا ستون ہو کہ اگر اس میں کسی رخنہ اندازی کو گوارا کر لیا جائے تو مذہبیات کی ساری عمارت دفعۃً منہدم ہو جائے گی، تصدیق، ایمان بالغیب اور نفسیاتی اذعان کا سارا دار و مدار عصمتِ انبیاء کے اعتراف پر ہے، عصمت کا خلل عصمت تک ہی نہیں رہ سکتا، بلکہ دوسرے اعتقادیات میں بھی خلل کا باعث ہوگا، تفسیر قرآن کے اجارہ دارون نے ذہنی اضمحلال کے ہاتھوں غلط روایات پر بھروسہ کرکے عصمتِ انبیاء کے مختلف پہلوؤں کو گرد آلود مجروح اور شکستہ کر دیا تھا، اور یہ نہ سمجھا کہ اس سے جس کتاب الٰہی کی تبلیغ اُن کی زندگی کا مشغلہ تھی، اوس پر ایمان لا سکنے کے دروازے بند ہوتے جا رہے ہیں،[۱] مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس اہم نکتہ کو محسوس کرکے اس کی طرف توجہ فرمائی، اور اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے[۲] ان کی نگاہ "یوسفی"

---

۱ معارف :- علماء میں متعدد بزرگوں نے اس پر کتابیں لکھی ہیں، امام رازی نے تفسیر کبیر میں اور ابن حزم نے فصل فی الملل والنحل میں قاضی عیاض نے شفا میں خفاجی نے اوسکی شرح میں اور ملا دوست محمد کابلی نے عصمۃ الانبیاء کے مسئلہ میں پوری تحقیق کی ہے ۲ رسالہ برہان دہلی،

ہو گئی، جس کو قرآن نے بڑی وسعت دی تھی، اور جس کو مفسرین نے بے معنی بنا دیا تھا، کوئی شک نہیں، کہ مولنائے محترم نے قرآنی شہادتوں کے پیش نظر عصمت یوسفی کو ثابت کرنے میں کمی نہیں کی، لیکن اس کے باوجود وہ آیت جو اسوۂ یوسفی کا پہلو متعین کرنے کے بارے میں زیر بحث تھی، اور جسے حیات یوسفی کے خط و خال کا مکمل عکس یا ان کے عملی اخلاق کا نقطۂ شعاعی (فوکس) کہہ سکتے ہیں، جن حقائق و معانی کی ترجمانی کر رہی ہے، میرے نزدیک وہ ہنوز تشنۂ تفسیر ہیں، اس لئے میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی، کہ ان نکات یا تشریحی پہلوؤں کو روشنی میں لے آیا جائے، اور شاید یہ کوئی گستاخی بھی نہیں ہے، جسے دنیائے علم معاف نہ کر سکے،

اس تاریخی واقعہ کے ذریعہ کتاب الٰہی نے فطرت انسانی کے دو پہلو پیش کئے ہیں، ایک زلیخا کے لباس میں، دوسرا حضرت یوسفؑ کے رنگ میں، زلیخا بھی حسن و جمال کا بہترین پیکر تھیں، اور حضرت یوسفؑ بھی زندہ جادو،[1] زلیخا کے رگ و ریشہ میں بھی شباب و رعنائی کی بجلیاں کوند رہی تھی، اور حضرت یوسفؑ کا سراپا بھی حسن و جوانی کا شاہکار تھا، چنانچہ قدرت نے شباب و حسن دونوں کو خلوت و تنہائی کا زرین موقع دیا تاکہ فطرت انسانی کے دو مختلف مظاہر شعور و احساس کے گوناگون تاثرات اور حیوانیت و ملکوتیت کی استعداد اور اس کے تنوع پذیر نتائج کا اندازہ ہو سکے، زلیخا شباب کے ولولہ اور نسوانی تاثر و انفعال کو نہ ٹھکرا سکیں، لیکن حضرت یوسفؑ باوجود امنگوں سے بھرا ہوا دل رکھنے کے جمالیاتی کشش کے طبعی تقاضے سے بالاتر ہو گئے، اسلئے سوال پیدا ہوتا ہے، کہ ایسا کیونکر ہو سکا، قرآن اس پیچیدہ نوعیت کا حل پیش کرتے ہوئے کہتا ہے

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ — زلیخا نے لذت اندوزی[2] کا خیال پختہ کر لیا تھا

[1] معارف اردو میں ان موقعوں پر جادو کا لفظ غیر معمولی کشش و تاثیر کے معنوں میں بولا جاتا ہے، جیسے حدیث نبوی ان من البیان لسحرا میں، تاہم بھی اس لفظ کے بجائے کوئی دوسرا لفظ ہوتا تو بہتر تھا، جیسے سراپا کشش" [2] معارف ترجمہ

رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ، (سورہ یوسف) — اور یوسف بھی خیال پختہ کر لیتے، اگر انھوں نے اپنے پروردگار کی دلیل نہ دیکھ لی ہوتی،

ایک نے برہان ربوبیت کا مشاہدہ کر لیا، دوسرا محروم رہ گیا، جس نے دلیل ربوبیت کا مشاہدہ نہیں کیا، اس کے جذبات کا مطالبہ قائم رہا، اور جس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اور کھلی آنکھوں سے اسکی نگاہیں تنویرات الٰہیہ تجلیات سرمدیہ اور انعکاسات ربوبیت سے جگمگا اٹھیں اور وہ تقاضائے فطرت کے نقش اول کو ثبات اور مردہ تصور کو عزم ارادہ اور تشخص ذہنی کی زندگی نہ دیسکا، ایک پیغمبر اور ایک معصوم کسی ایسی چیز کا تصور کر سکتا ہے یا نہیں جو فطرت کی تشنگی دور کرنے کے ساتھ ہی دوسرے لمحہ میں گناہ بھی ہو سکتی ہو؟ دوسرے برہان ربوبیت کا مشاہدہ کس راز کی عقدہ کشائی اور کس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟ یہ دو سوال ہیں، جن کو بغیر سلجھائے ہوئے گذر سکنا ممکن نہیں، ہمارے مولینا نے بھی ان سوالات کے حل کرنے کی کوشش کی ہے، مگر وہ حل میرے قلب کی تسکین نہ کر سکا،

مستقبل میں پیغمبر ہونے والا تو رہا ایک طرف خود پیغمبر بھی تمام پیغمبرانہ خصائص کے باوجود انسان ہوتا ہے، اور انسانی فطرت سے معمور جنسی جبلت انفرادی نفسیات شعوری رجحانات جسمانی نشو و نما، اخلاقی استعداد، بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے وہ تمام تاثرات اسکی زندگی کے ہر گوشہ پر اسی طرح نقش ہوتے ہیں، جس طرح کسی عام انسان میں ہر وہ جذبہ، ہر وہ تصور اور ہر اس کارکردگی کی صلاحیت جو ایک انسان کی صورت نوعیہ کے دامن سے وابستہ ہے، پیغمبر بھی اپنی بزرگی اخلاقی ارتقار اور روحانی عظمت کے باوجود سب کچھ وہی رکھتا ہے، انسانی فطرت اور پیغمبرانہ استعداد کے درمیان اگر کوئی فرق ہے، تو صرف اتنا کہ جو جذبات، تصورات اور ماحولی موثرات معمولی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۶) میں بہٖ اور بہا کا ترجمہ رہ گیا ہے،

حالات مین ایک انسان کو حیوانیت، مظالم، بے راہ روی اور کشمکش ذہنی کے بھنور مین پھینک دیتے ہین، وہی خصائصِ نبوت سے سرفراز ہستی کو ملکوتیت عدل وانصاف، صراطِ مستقیم خداپرستی اور طہارتِ نیت وجدان وشعور سے بہرہ اندوز کرنے کا فرض انجام دیتے ہین، تفاوت آغاز مین نہین، انجام مین ہوتا ہے، محبت ونفرت، حُسن وشباب سے لذت اندوزی اور غیر جمالیاتی مناظر سے کراہت پیغمبر مین بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے یہ جذبات حدودِ الٰہی سے تجاوز نہین کر سکتے، میرے نزدیک اس نظریہ مین کوئی صداقت نہین، کہ حُسن سے دلچسپی لے سکنے کی استعداد ہی ایک پیغمبر مین نہین ہوتی، کیا وہ حدیث فراموش کیجا سکتی ہے، جس مین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ مجھے دو چیزین پسند ہین، عورت اور خوشبو، زندگی کے جمالیاتی پہلوؤن مین کشش محسوس کرنا، کثافت نہین، لطافت کا ثبوت ہے، حضرت یوسفؑ مین بھی وہی جذبات اور اسی جوش وولولہ کے ساتھ موجود تھے، جنکا تصور زلیخا کے لئے کیا جا سکتا ہے، فرق یہ تھا کہ زلیخا کی نگاہین اس بُرہانِ ربوبیت تک نہ پہنچ سکین جسے حضرت یوسف کی نگاہون نے دیکھ لیا، اگر وہ برہانِ ربوبیت کا مشاہدہ نہ کر لیتے تو یقیناً لغزش کے امکانات تھے، لیکن حقائق تک ایک پیغمبر کی نگاہ کا نہ پہونچنا ممکن نہ تھا، ایسی صورت مین کوئی تصور، کوئی ارادہ اور کوئی عزم، عمل کی دنیا تک نہین پہونچ سکتا تھا، جوانی کی آرزوئین دونون کیلئے حُسن مین کشش رکھتی تھین، لیکن ایک کشش نے نگاہون کو بوجھل کر کے جھکا دیا، اور ایک نے شعاعِ باطن کے سہارے اٹھا دیا، یہ کہنا قطعاً قابلِ تسلیم نہین کہ برہان ربوبیت کا مشاہدہ نہ ہونے پر بھی حضرت یوسف اور زلیخا کے تصورات مین وہی تفاوت رہتا جو مشاہدہ کی صورت مین دنیا نے دیکھا، اگر یہی بات تھی تو برہان ربوبیت کا مشاہدہ کرانا قدرت کا ایک غیر ضروری اضافہ اور معنویت سے تہی فعل قرار پائے گا، حالانکہ قدرت کے کسی فعل بلکہ ارادہ کا بے معنی ہونا اس سے کہین زیادہ محال ہے جتنا کہ انبیاء کا معصوم نہ ہونا، "لولا" کی صرفی اور نحوی بحث وگفتگو نتیجہ خیز نہین ہو سکتی،

صرف اتنا دیکھ لیجئے کہ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسیٰ فَارِغًا والی آیت مین بھی "لولا" کی نگاہ وکرم بے قراری اور ایسی بے قراری کو فنا نہ کر سکی، جو راز کے افشاء پر مجبور کر رہی تھی، خدا نے اس کو اتنا ضبط وتحمل دیدیا کہ وہ باوجود بے قراری اور نفسیاتی ہیجان کے اُس راز، اُس تہیہ طوفان اور اس جذباتی اذیت وکشمکش کو دل مین لئے بیٹھی رہی، جذبات کی ٹرمیوے باندھ دی گئی تھی، اگرچہ اس کا انجن شور کر رہا تھا، کیا اس سے خود اضطراب اور اس کے تموجات کا عدم ثابت ہوتا ہے؟ ہرگز نہین، پھر یہی بات اس آیت مین بھی کیون نہ تسلیم کی جائے، جو عنوان بحث ہے، حضرتِ یوسفؑ کے دل مین بھی جمالیاتی انجذاب زندہ تھا، برہانِ ربوبیت کے مشاہدہ نے جذبات کی ہواؤن کا رُخ اِدھر سے اُدھر کر دیا، ورنہ کوئی شک نہین کہ دل زندہ کے تڑپ اُٹھنے مین دیر نہ تھی یہی وہ خصوصیت وامتیاز ہے، جو پیغمبر کو عام انسانی فطرت سے نہین، بلکہ اسکی حیاتِ عملی سے ممتاز اور بلند تر کر دیتا ہے، جمالیاتی احساس سے زلیخا نے کثافتون سے تردامن ہونے کا فیصلہ کر لیا، لیکن اسی احساس نے حضرتِ یوسفؑ کو بُرہانِ ربوبیت کا مشاہدہ کرا دیا ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ،

مین اپنے اس خیال کی تائید مین قرآن کی شہادت بھی پیش کر سکتا ہون، اسی آیت کا دوسرا ٹکڑا ہے،

کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ،

ایسا ہی ہوا (برہان ربوبیت کا مشاہدہ کرایا گیا) تاکہ برائی اور کھلی ہوئی برائی کو یوسف سے ہٹا دین، کیونکہ وہ ہمارے پرخلوص پرستش کرنے والون مین سے ہ

انصراف کے کیا معنی ہین؟ رجوع عن المقصد کسی خیال کو چھوڑ دینا، باز آجانا، اگر کسی چیز کا خیال تک بھی دل مین نہ پیدا ہوا تھا، اور کسی سخت گناہ کے قدم ان کی طرف تیزی سے نہین بڑھ رہے تھے

لہ ٹرمف بمعنی حفظ پر آئندہ صفحات مین روشنی ڈالی گئی ہے،

تو انحراف کو کون سے انتقالِ ذہنی کا ترجمان قرار دیا جائے گا، جب کچھ نہ تھا، تو انحراف کیسا اور کس بات سے؟ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرانہ علم وعمل نے ان کی استعداد و فطرت کو اتنا بیدار کر دیا تھا، کہ وہ حق سے باطل کا امتیاز بھی کر سکتے تھے، اور مجاز سے حقیقت تک پہونچ بھی سکتے تھے، اسی بنا پر باطل کی طرف جاتے جاتے، حق کی جانب واپس ہو سکے،

مین سمجھتا ہون کہ یہان ایک مغالطہ ہوا ہے، جس کی وجہ سے بعض حضرات پاک دامنی کے قائل نہ رہ سکے، اور بعض علما نے "پاکیٔ دامان" کی حکایت اتنی بڑھا دی، کہ اوس کو فطرتِ انسانی کے حدود ہی سے خارج کر دیا، وہ مغالطہ میرے نزدیک یہ ہے کہ "ھَمّ" تصور اور ارادہ دونون معانی کا آئینہ دار تھا، اس لئے یا تو ان دونون کو تسلیم کر لیا گیا، یا حضرت یوسفؑ کی حد تک دونون سے انکار کر دیا گیا، حالانکہ باوجود اس کے کہ تصور اور ارادہ کی ماہیت ایک ہے، اور "ہم" کے معنی مین یہ دونون داخل ہین، پھر بھی اگر کوئی قرینہ ہو تو ایک ادیب، زبان دان اور ماہر لسانیات کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک جگہ معنی کے دونون جز شامل کرلے، اور دوسری جگہ دونون معنی مین سے ایک کو لے، زبان و ادب کا آئین زلیخا کے لئے تصور و ارادہ دونون اور حضرت یوسفؑ کے لئے تنہا تصور کرنے سے مانع نہین، تصور عمل سے دور تر ارادہ کا نام ہے، اور ارادہ عمل سے قریب تر تصور کا، ارادہ سے تصور کو الگ نہین کیا جا سکتا، تصور ہی کی بنیادون پر ارادہ استوار ہو سکتا ہے، اور محض تصور مین ارادہ کا کوئی امکان نہین، ارادہ تصور کی ایک ارتقا یافتہ نوعیت کا نام ہے، پہلی منزل دوسری منزل کی قطع مسافت فراہم نہین کر سکتی، علاوہ ازین "لولا" کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہین، کہ تصور و ارادہ دونون کو حضرت یوسفؑ کے لئے جائز رکھا جا سکے، کیونکہ اس صورت مین برہانِ ربوبیت کا اضافہ بے معنی ہو جاتا ہے، دونون نے "ہم" کیا ایک کا "ہم" عمل سے قریب تر تھا، اور ایک کا بعید تر، قرآن نے یہی نازک فرق دکھایا ہے، "ھَمّ بِھَا" کے معنی ہی یہ ہین

کہ وہ تصور جو عزم وعمل سے دور تر حقیقت کا نام ہے، ضرور کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ

"میلانِ طبع کے اضطراری درجہ کو ہمّ (ارادہ) کی جزی بتانا، اور اوس کا ایک جز و تسلیم کرنا محلِ نظر ہے، کیونکہ کلامِ عرب سے اسکی کوئی واضح نظیر نہین ملتی، لغتِ عرب مین میل و ارادہ کا جو فرق ہے، وہ بیّن اور واضح ہے"

مجھے اس سے انکار نہین کہ میل یا جذبِ طبعی ایک وجدانی حقیقت ہے، اور ارادہ ایک ذہنی وجود، ایک شخص کہہ سکتا ہے، کہ ایک ہی "ہم" کو دو معنی مین لینا قطعاً غلط ہو گا، لیکن یہ چیز بھی ناقابلِ انکار ہے، کہ اس درجہ مغائرت کے باوجود جذبِ طبعی اور قوتِ ارادیہ مین اتنا عدم تشاکل بھی نہین کہ میل اور ارادہ کے موثرات سے، ان ہی دونون کی استعداد تاثر و انفعال کوئی نقش نہ قبول کرتی ہو، ارادہ بغیر جذبِ طبعی یا غیر طبعی کے نہین ہو سکتا، اور جذبِ نفس بربطِ ادراک چھیڑے بغیر نہین رہ سکتا، ایک کا وجود دوسرے کو مستلزم ہے، یہی وہ التزام ہے، جس نے میل اور ارادہ مین ایک گونہ مشابہت اور ایک گونہ مغائرت کا برزخ پیدا کر کے میلانِ طبع کو ارادہ کی جزئی قرار دینے پر مجبور کر دیا، لیکن یہ کوئی ایسا گناہ بھی نہین، جو آج تک یورپ کے نفسیاتین نہ کر رہے ہون، ادراک و احساس کے حقائق آج تک حل نہ ہو سکے، محققین کی ایک جماعت ہے جو عصبی ہیجان ہی کو حقیقت ادراک یا کم از کم اسے ادراک کی پہلی منزل یا شرطِ اوّل بتاتی ہے، علما اور محققین کی مجلس مین قرآن پر بدوین اور دہقانانِ عرب کے نقطۂ نظر ہی سے بحث کی اجازت دینا غالباً دنیائے علم و تحقیق پر بیجا پابندی ہو گی، ذہنی ارتقا، بدویت کی پاسبانی نہین کر سکتا، فاضل مضمون نگار کو اندازہ ہو گیا ہو گا، کہ میرے نزدیک نفئ ارادہ کا کمزور عذر پیش کرنے کی ضرورت نہین، بلکہ خود "ہم" کی آغوشِ معنویت اتنی وسعت و کشادگی رکھتی ہے، کہ زلیخا اور حضرت یوسفؑ دونون اس کے ایک ایک پہلو مین اپنی اپنی استعداد کے مطابق سما سکتے ہین،

مصنف کشف اصطلاحات الفنون لکھتا ہے؛[1]

وقال الحکماء "الھم" کیفیۃ نفسانیۃ
یتبعھا حرکۃ الروح والحرارۃ
الغریزیۃ الی داخل البدن و
خارجہ لحدوث امر یتصور فیہ
وھو خیر یتوقع وشر ینتظر فھو
حرکۃ من خوف ورجاء فایھما
غلب علی الفکر تحرکت النفس الی
جھتہ فان غلب الخیر المتوقع
تحرکت الی خارج البدن و
ان غلب الشر المنتظر تحرکت
الی داخلہ ولھذا قیل انہ
جھاد فکری،

فلاسفہ اسلام "ہم" کو ایک ایسی وجدانی کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں جس کے اثنا پر روح حیوانی اور حرارت غریزی حرکت کرتی ہو، بدن انسانی کے باطنی پہلو کی طرف یا اوس سے باہر والی دنیا کے رُخ پر تاکہ اس نقش و تصور کے مطابق جو وجدان میں پایا جاتا ہے، کوئی کام کر سکے، خواہ وہ تصور خیر کی توقعات لئے ہوئے ہو یا شر و فتنہ کا انتظار، اسی لئے "ہم" امید وبیم اور خیر و شر کی ایک ترکیب یافتہ حقیقت کا نام ہے امید وبیم میں سے جو جذبہ بھی قوت فکریہ پر غالب آجائیگا، قوائے حیوانیہ کی توجہ اس جانب ہو جائیگی، اگر توقعات خیر غلبہ حاصل کر لیں گی، تو روح حیوانی خاکدان مجازی کے تماشہ میں مصروف ہو جائے گی، اور اگر بیم و شر کا انتظار مجسم ہو کر سامنے آجائے تو سمٹ کر ہیکل جسمانی میں قلعہ بند ہو جائے گی، اسی بنا پر ہم کو قوت فکریہ

[1] کشف اصطلاحات الفنون جلد ۱۹ ص ۱۵۳۰

خواب پریشان کی اس تعبیر سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ "ہم" کے مضمر تصورات کوئی ایسی لطافت و کثافت نہیں رکھتے، جو تصور کے سانچہ میں رہنے کے باوجود خیر و شر سے منسوب ہو سکیں، وہی تصور خیر بھی ہو سکتا ہے، اور وہی تصور شر اور گناہ بھی۔ ہاں اگر محبت و نفرت، امید و بیم اور خیر و شر کا کوئی ایک پہلو قوائے فکریہ اور طبعیہ کو اپنی آغوش تربیت میں قبول کر لے، اور وہی جذباتی دنیا پر غالب و محیط ہو جائے، تو "ہم" کے تصورات کو خیر یا شر سے وابستہ کر سکتے ہیں، صرف سادہ تصور جو امید و بیم اور خیر و شر کے مشترک اور غیر متعین پہلو رکھتا ہو، جرم و ثواب نہیں ہو سکتا، جسم و فکر کا جہاد و انقلاب لاتا ہے، کبھی بہتر انقلاب کبھی بدتر انقلاب، اسی لئے جہاد اور سعی و عمل کو اس وقت تک درخور اعتنا، یا ناقابل پذیرائی قرار نہیں دیا جا سکتا، جب تک کہ وہ حق و باطل کے ثبات و اعلان کا باعث نہ ہو جائے،

حضرت یوسفؑ نے اگر "ہم" کیا تو محض اس لئے اُس کو جرم و گناہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہی "ہم" زلیخا کی نسوانیت نے بھی کیا تھا، کیونکہ یہ مشاکلت اور مشابہت محض تصور کے حدود تک ہے۔ غلبہ اور ہیجان کی سرحد پر پہونچ کر دونوں کے راستے الگ الگ ہو گئے، زلیخا پر امید و بیم کے زاویۂ نظر کا غلبہ ہو گیا، اور حضرت یوسف، اشارۂ ربوبیت، مطالبۂ عبدیت اور خوف خدا سے لرز اٹھے، قدم ڈگمگائے، اور ٹھہر گئے، نگاہ اٹھی، اور جھک گئی، دل تڑپا، اور ٹھہر گیا، وہ نگاہ جو حسن کی رعنائیوں کا جائزہ لے رہی تھی قبل اس کے کہ حسن کی خاک میں دفن ہو، بیدار ہو گئی، اور شہپر پرواز کی ایک ہی جنبش میں کہیں سے کہیں پہونچ گئی،

کیا یہ انداز گناہ کا انداز تھا؟ کیا اس "ہم" ارادہ یا تصور سے ناپاکی ٹپک رہی ہے؟ کیا یہ انسانی فطرت کا بڑا معجزہ نہیں؟ وہ کونسا ضعف و اضمحلال ہے، جو زلیخا کی زلف مشکین کو مس نہ کر رہا ہو اور وہ کونسا حسن و کمال ہے جو حضرت یوسفؑ کے قدم نہیں چوم رہا، اس تمام تفاوت و امتیاز

کے باوجود اگر عصمت یوسفی زخم خوردگی سے کسی کے نزدیک نہ بچ سکتی ہو تو اس کا کیا علاج، ؟

کیا پیغمبرانہ عصمت کے یہ معنی ہیں، کہ پیغمبروں سے طبعی میلانات اور جمالیاتی تصورات تک کی استعداد سلب کر لیجاتی ہے، یہ قابلِ تسلیم نہیں جب تک ان کے خمیر میں انسانی فطرت کا تقاضا ہے، جمالیاتی کشش اور طبعی تقاضے کو اُن کی سرشت سے نہیں نکالا جا سکتا، یہ جنت نہیں ہے، جس سے حضرت آدمؑ کو نکال دیا گیا تھا، یہ انسانی فطرت ہے جس کا قانون نہ کسی کی رعایت کرتا ہے، نہ کبھی تبدیل ہوتا ہے، فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا، لا تبدیل لخلق اللہ" انبیاء گناہ سے پاک ہیں، "گناہ، وجدانی احساس، ذہنی عزم اور عمل کا نام ہے، حُسن سے پاکیزہ کشش محسوس کرنا، اور لذت کا اس حد تک تصور کرنا جو ربابِ نفس کے نغمات نہ چھیڑ رہا ہو، گناہ کی فہرست کا کوئی جزء نہیں ہو سکتا یہ انسانی فطرت ہے، اور اس گناہ سے انسانیت معصوم نہیں رہ سکتی، فطرت سے بالاتر ہو جانا، کسی شخصیت کیلئے اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کوئی دوسری فطرت اسکی جگہ نہ لے لے۔ انسانیت کا ارتقاء خالص ملکوتیت میں مضمر نہیں، بلکہ حیوانیت و ملکوتیت کے اختلاط، باہمی ربط اور "دوگونہ رنج وعذاب" میں ہے، اگر عصمتِ انبیاء کا مطلب اس کے سوا کچھ اور سمجھا گیا ہے، تو مجھے معاف رکھا جائے کتابِ الٰہی اس اختراعی عصمت کی تائید نہیں کرتی، اگر حضرت یوسفؑ میں حُسن کی کشش اور اسکے جادو سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں تھی، تو پھر پاک دامنی کا چرچا کیوں ہو، ایسی معصومیت محاسنِ انسانی کا کوئی پہلو نہیں رکھتی، بلکہ قوائے انسانی کے اضمحلال کا نتیجہ ہوگا، خصوصاً اس وقت تک تو ایسی معصومیت کے دعاوی کوئی موزونیت اور وزن ہی نہیں رکھتے، جب تک کہ کسی انسان کو تاجِ نبوت سے سرفراز نہ کیا گیا ہو، بلوغ و رشد کے بعد حضرت یوسفؑ کو حقائق کا علم اور حق و باطل میں امتیاز کی اتنی قابلیت دی گئی تھی، جو کم و بیش انسانی فطرت ہی کا ایک جزء ہے، نہ کہ عصمت کا جو ملکوتی فطرت کا خاصہ ہے،

کلام الٰہی کا کوئی ٹکڑا ابھی ایسا نہیں دکھایا جا سکتا، جس میں مرتبۂ نبوت پر فائز ہونے سے پیشتر یا اس کے بعد تقویٰ، خُلقِ عظیم اور عبدیت نہیں، بلکہ معصومیت تامّہ کا غیر فطری تخیل انبیاء کی طرف منسوب کیا گیا ہو، یا تقویٰ اور طہارت ہی کو اس حد تک "ہستی کا خمیر" بنا دیا گیا ہو، کہ عمل اور ارادہ سے دور تر خیالات، خواطر اور تصورات کا بھی وہاں تک گذر نہ ہو سکتا ہو، خواطرِ نفس ہمارے محاورہ میں جو معنی رکھتے ہیں، وہ یقیناً انبیاء کے لئے موزون نہیں، مگر وہ اپنی تصوری حقیقت کے سایہ میں ہرگز اجزاے نبوت سے کوئی بے ربطی نہیں رکھتے، ھَاتُوا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ، اگر مجھے اجازت دیجائے تو میں یہ کہنے کی جرأت کرون گا، کہ انبیاے کرام کے متعلق یہی ان غلط اعتقادات کا نقطۂ آغاز ہے، جس سے انبیاء کا انسان، فرشتہ اور ہر دوسری مخلوق سے بالاتر ہو کر "خدا کا بیٹا" اور پھر صرف "میم" کا پردہ رکھتے ہوئے "احمد" سے "احد" ہو جانے کا تصور پیدا ہوا، بت پرستی کا آغاز، تصورِ شیخ کے پاک تخیل سے ہوا تھا، اور الوہیت انسانی کا آغاز عصمتِ انبیاء کے سنجیدہ اعتقاد سے ہوا، حدود سے ذرہ برابر تجاوز ہمیشہ "کعبہ سے ترکستان" لیجا رہا ہے، اور لیجاتا رہیگا، قرآن "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ" کی حقیقت پیش کرتا ہوا بتاتا ہے، کہ تکمیلِ دین کا امتیاز رکھنے والا پیغمبر بھی صرف بشریت ہی نہیں رکھتا، بلکہ ہماری جیسی بشریت، انسانیت اور فطرت رکھتا ہے، اگر وحی والہام کے عکوس مجردہ جذب کرنے کی استعداد، ارتقاء اور سعادت کو نظر انداز کر دیا جائے، تو فطرتِ انسانی کا کوئی پہلو ایسا باقی نہیں رہتا، جو ہمارے اور پیغمبر کے درمیان مشترک نہ ہو، جب پیغمبر عرب صلعم کا یہ حال ہے، تو "تا بہ پیغمبر مصر چہ رسد"، مگر ہمارے تمام علماء انبیاء کی بحث میں ان کو عام انسانی فطرت ہی سے بالاتر قرار دینے پر زور دیرہے ہیں، حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان میں غالباً ایسے ہی توہمات کو دور کرنے کی غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے "بڑے بھائی" کا خطاب جائز رکھا، اگر انبیاء علیہم السلام عام انسانی فطرت

سے بلند اور طبعی عصمت سے بہرہ ور ہوتے، تو ابلیسی قوت کے ہزار مکر و فریب اور حضرت حوا کی ہزار خوشامدوں کے باوجود حضرت آدم گیہوں کا ایک دانہ بھی کام و دہن میں نہ لیجا سکتے تھے، مغالطہ مادی تصور، اور نفسیاتی تاثر انسانی فطرت کا ایک جزء ہے، اور اس آلودگی سے انسانیت کا دامن اوس وقت تک پاک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اُسے ملکوتیت کے سانچہ مین نہ ڈھال دیا جائے،

مولینا اسماعیل شہید اپنی تصنیف منصب امامت مین تحریر فرماتے ہین[۱] :۔

"عصمت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اقوال، افعال، عادات، عبادات، معاملات و مقامات، اخلاق و احوال کو مداخلت نفس و شیطان و خطا و نسیان سے اپنی قدرت کاملہ سے محفوظ رکھتا ہے، اور ان پر اپنے ملائکہ حافظین مقرر کر دیتا ہے، کہ غبار بشریت سے ان کا دامن پاک رکھین، اور نفس بہیمی اپنے بعض مکنونات کو نہ اُبھارے اگر کبھی کوئی چیز اللہ کی رضامندی کے قانون سے خارج ہو جاتی ہے تو حافظ حقیقی اُن کو آگاہ کر دیتا ہے اور عصمت غیبیہ طوعاً و کرہاً اُن کو کشان کشان راہ راست پر لے آتی ہے۔"

اس عبارت سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ انبیاء مین نفس بہیمی رہتا ہے، اور بعض مکنونات کے ساتھ رہتا ہے اور ان مین رضاے الٰہی کے قانون کی خلاف ورزی کی فطری استعداد ہوتی ہے، اس سے پاک دامن رہنے کی اگر کوئی صورت ہے تو وہ "فطری عصمت" کے ذریعہ نہین، بلکہ "غیبی محافظت" اور ملائکہ محافظین کے ذریعہ اور پھر یہ صرف طوعاً کی حد تک نہین بلکہ کرہاً کی نوبت بھی پہونچ سکتی ہے، کیا یہ وہی بات نہین ہے جس کا تذکرہ پچھلے صفحات مین کیا جا چکا ہے،

مین اگر مولانا ے محترم کی ذات سے یہ امید رکھون تو غالباً بیجا نہ ہوگا، کہ وہ عصمت انبیا کے نظریہ پر ایک مستقل عنوان مین زیادہ مفصل بحث فرمائین گے، تا کہ قرآن، حدیث، تصوف، علم کلام اور

۱۔ تاریخ سید احمد شہید،

تاریخ کی روشنی مین یہ معلوم ہو سکے، کہ اس بارے مین تحقیقی نظریہ کیا ہو سکتا ہے، مجھے انبیاے کرام کے پیدایشی طور پر معصوم ہونے کی کوئی نقلی اور عقلی شہادت نہ مل سکی، حضرت یوسفؑ کے سلسلہ مین بھی عصمت کی بنیاد قرآن نے حکم یعنی حق و باطل مین امتیاز کر سکنے کی استعداد علم حقائق کے ملکہ، عبدیت اور خلوص قلب کی لطافت کو بتایا ہے، اور وہ بھی حد بلوغ کو پہونچنے پر، نہ کہ فطرت معصوم کو، خدا جس کسی سے پیغام رسانی کا کام لینا چاہتا ہے، اس مین علم فراست اور عبدیت کے ذریعہ ایسا راسخ ملکہ پیدا کر دیتا ہے، کہ وہ رذائل، فواحش اور گناہوں سے آلودہ دامن نہین ہوتے، یا ہوتے ہوتے بچ جاتے ہین، یہ استعداد کم و بیش ہر انسان مین ہوتی ہے، اولیاء اور مخلصین اُمت اس کو عمل و اکتساب سے ترقی دے لیتے ہین، اور انبیاے کرام عمل قلیل اور موہبت کثیر کے ذریعہ اُن سے کہین زیادہ بلند ہو جاتے ہین، ان کا ایک لمحۂ عبادت، عام انسانون کی شب و روز کی عبادت سے کہین زیادہ روحانیت اور حقائق پذیری کی استعداد رکھتا ہے، اس امتیاز و فوقیت کے علاوہ ان کے دامن مین فطرت کے وہی جواہر ریزے ہوتے ہین، جن سے کائنات انسانی کا ہر ذرہ چمک رہا ہے،

دوسری چیز برہان ربوبیت کی معنوی حقیقت ہے، اور شاید مین یہ خیال کرنے مین حق بجانب ہون کہ برہان ربوبیت کے معنی تک نارسائی ہی نے علماء اور مفسرین کو عصمت کے غیر فطری تخیل اور کشمکش ذہنی مین مبتلا کر رکھا ہے، ورنہ اتنی سی بات کا افسانہ نہ ہو سکتا تھا، مجھے سخت حیرت ہے، کہ صدیون پہ صدیان گذرتی رہین، لیکن مفسرین کی نگاہ اس نکتہ تک نہ پہونچ سکی، جہان بہت جلد پہونچ جانا چاہئے تھا، ذرا سی بات اور یہ درازی شب ہجران،

امام رازی نے ان روایات اور قصص کو غلط ٹھہرایا ہے جو برہان ربوبیت کا مفہوم متعین کرنے کے لئے اختراع کئے گئے تھے، گو میرے نزدیک ان کے انکار کی کوئی وقعت نہین، انھون نے صرف عقل و شعوری ارتقاء کو خضر راہ بنانے پر اکتفا کر لیا ہے، حالانکہ بعض حقائق ایسے بھی ہوتے اور ہو سکتے

ہیں، جو شعور کی گرفت سے آزاد اور بلند تر ہوں، یہی وجہ ہے کہ جو روایات امام رازی کے نزدیک سرے سے قابلِ توجہ ہی نہیں، وہی روایت شاہ ولی اللہ رح جیسی ہستی کے نزدیک قابلِ پذیرائی ہے، یعقوب علیہ السلام کی ہیئت تمثیلیہ کا حضرت یوسف کو نظر آنا، ہمارے فلسفی کے خیال میں غلط اور منکر ہے، مگر شاہ ولی اللہ صاحب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اسی کو تسلیم کرتے ہیں اور ممکن الوقوع سمجھتے ہیں، حضرت مجدد الف ثانی کی طرح ان کے نزدیک بھی لطائف روحانیہ اور قوائے باطنیہ مجردہ کا انفرادی اصلاح کی غرض سے تمثیلِ شخصی میں رونما ہونا نہ مستبعد ہے نہ قانونِ قدرت کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی ہے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس رویت کی تمثیل شخصی اور لطیفہ مجردہ کے نظارہ کو برہانِ ربوبیت کا مشاہدہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا، اور نہ ان تمام مختلف معانی کے لئے اس آیت میں کوئی گنجائش ہے، جن کو امام جعفر صادق رح وغیرہ سے نمبروار بیان کیا گیا ہے، یہ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ اوس پرواز تخیل اور اوس تگ و دو کیلئے جو علمائے سابق نے اپنی نیک نیتی سے فرمائی ہے، برہانِ ربوبیت کے معنی میں کون سی بنیاد تھی اگر اس وسعت کے ساتھ تفسیر کرنے کے حقوق دیے جا سکتے ہیں، تو باطنیہ، معتزلہ اور دیگر فرقِ اسلامیہ کو کیوں اپنے اپنے مفروضہ تصورات واذعانات کے تحت تفسیر کرنے کی اجازت دیجائے، لیکن کیا ہر شخص کو اپنی علمی استعداد ذہنی رجحان اور جذباتی تاثر کے مطابق معانی اختراع کر سکنے کے حقوق دئے جا سکتے ہیں؟! میں صاف الفاظ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرونگا، کہ ان بیان کردہ معانی کو برہانِ رب سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، کہاں برہانِ ربوبیت کا مشاہدہ، اور کہاں یہ نکتہ آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں کہ

(۱) برہانِ رب نبوت کا وہ منصب ہے جو تمام تلویثات سے پاک رکھتا ہے،

(۲) اس حجت و دلیل کا نام ہے، جو زنا اور دواعی زنا سے بچاتی اور بدکار کے پاداش عمل

کو ظاہر کرتی ہے،

(۳) ایسی خلقت کا نام ہے، جو ہر قسم کے رذائل سے دور کرتی اور اعمال مقدسہ کو جبلت بنا دیتی ہے،

وہی ایک برہانِ رب کہیں منصب نبوت ہو گیا، اور کہیں حجت علی الزنا، کہیں پاداش عمل کا مظہر ہو گیا، اور کہیں جبلت ملکوتی، آخر ان تمام معانی اور نکاتِ ذہنی کے لئے برہانِ رب میں کونسی بنیاد ہے، اور اگر کوئی بنیاد ہے تو کیا وہ ایسی لچک دار ہے کہ اُس سے ہر قسم کا قیاس قائم کیا جا سکتا ہے، کیا منصب، حجت اور جبلت کے حقائق ثلثہ ماہیت میں متحد ہیں، اور کیا منصب کو حجت، حجت کو جبلت اور جبلت کو مظہر کہدینے میں کچھ حرج نہیں، برہان اور حجت میں ضرور نسبت ہے مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مخصوص طور پر زنا اور اوس کے دواعی و محرکات سے محفوظ رکھنے والی حجت کونسی ہے، اور اس کا علم کہاں سے حاصل ہوا، پھر اس حجت کو مشاہدہ میں بھی آنا چاہیئے، قرآن نے برہان کے ساتھ رویت و مشاہدہ کی خصوصیت کا اضافہ کیا ہے، مگر حجت علی الزنا کیلئے افسوس ہے کہ مشاہدہ کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں، بنابرایں برہانِ ربوبیت کے تحقیقی معنی اس کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے جو اجتہاد و تفسیر کا دعوی نہ رکھنے کے باوجود میں عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں،

میرے علم و تحقیق کا جہاں تک تعلق ہے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ برہانِ رب سے برہانِ ربوبیت مراد ہے جس کا مشاہدہ حضرت یوسف ؑ کی آنکھوں نے زلیخا کے جمالیاتی ارتقاء میں کیا، برہانِ ربوبیت کیا چیز ہے، اور اوس کا تماشا حُسن زلیخا میں کیا جا سکتا تھا یا نہیں، اسکا جواب بہتر یہ ہوگا کہ مولانا ابو الکلام آزاد کے الفاظ میں دیا جائے، اگرچہ مجھے ان کے تفسیری نکات سے بڑی حد تک اختلاف ہے، اور کسی فرصت کے موقع پر ان اختلافی پہلوؤں کو پیش کرونگا انشاء اللہ ارادہ ہے، لیکن چونکہ انھوں نے اس بُرہان ربوبیت کے نکات حل کرنے میں سبقت

کی ہے، جس کی آرزو مدت سے میرے دل میں تھی، اس لئے میں چاہتا ہون، کہ "اَلفَضلُ لِلمُتقدّم" کا لحاظ کرتے ہوئے بطور اعتراف اُنہی سے استناد کیا جائے، برہانِ ربوبیت کے اُن پہلوؤن پر جن کو قرآن نے گوناگون انداز سے پیش کیا ہے، اگرچہ اب بھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے تاہم اس کے اہم پہلو اس حد تک ضرور روشنی میں آگئے ہین، کہ ان سے ہمارا مقصد پورا ہو سکتا ہے، اس لئے اُنہی تعبیرات کو نقل کیا جاتا ہے،

"ربوبیت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہین، دنیا مین سودمند اشیار کی موجودگی کے ساتھ ان کی بخشش و تقسیم کا ایک نظام بھی موجود ہے، اور فطرت صرف بخشتی ہی نہین، بلکہ جو کچھ بخشتی ہے، ایک مقررہ نظام اور ایک منضبط ترتیب و مناسبت کے ساتھ بخشتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہین کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لئے جس جس چیز کی ضرورت تھی ٹھیک ٹھیک اسی طرح ان ہی وقتون مین، اور اسی مقدار مین اُسے مل رہی ہے اور اسی نظم و انضباط سے یہ کارخانۂ حیات چل رہا ہے،

اس سے معلوم ہو گیا کہ زندگی کے لئے جس جس چیز کی، جس جس طرح اور جیسی جیسی مقدار مین ضرورت ہو، اس کا نظام و تناسب کے ساتھ ہونا بھی ربوبیت کا ایک جز ہے اور یہ جز حسن و زیبائی کا اہم ترین جز تھا،

اس عبارت کے آگے تقدیر یا اندازۂ فطرت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہین :-

"چنانچہ ہم دیکھتے ہین، کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قوی کیلئے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا ہے، جس سے وہ باہر نہین جا سکتا، اور یہ اندازہ ایسا ہی ہے جو اس کی زندگی اور نشو و نما کے تمام احوال و ظروف سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہے"

یعنی جسمانی ساخت کا خاص اندازہ سے ہونا بھی اور اس طرح ہونا کہ اس سے ہر گوشۂ ارتقا

مین خواہ عضوی ہو یا جمالیاتی، ٹھیک ٹھیک مناسبت رہے، ربوبیت کے دائرہ مین داخل ہے،

پھر جمالِ فطرت کو عام طور پر اور تقویم انسانی کے پہلوؤن کو خاص طور سے ربوبیت کی نگرانی مین دیتے ہوئے فرماتے ہین،

"فطرتِ کائنات مین تحسین و آرایش کا قانون کام کر رہا ہے، وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے، ایسا بنے کہ اس مین حُسن و جمال اور خوبی و کمال ہو،

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ[1]	اوس نے آسمان و زمین حکمت و مصلحت
وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ	کے ساتھ پیدا کئے اور اُس نے تمھاری صُورتین
	بنائین تو کیسی حسن و خوبی کے ساتھ بنائین

تقویم انسانی کے جمالیاتی ارتقا، کو خصوصًا اور کائناتِ ارضی و سماوی کے ہر پیکر کو عمومًا مظاہراتِ ربوبیت کا شاہکار بتاتے ہوئے نظامِ ربوبیت کے مشاہدہ سے جس نفسیاتی دلیل و برہان کا چشمہ پھوٹتا، بہتا، اور لہراتا ہوا نکلتا ہے، اس کی موج در موج روانیون کو دکھاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہین، :-

---

[1] حق کے معنی حکمت و مصلحت بتانا اگرچہ یہان پر کچھ غیر موزون نہین معلوم ہوتا، لیکن میرے نزدیک اس سے اُن دقائق و نکات پر پردہ پڑ جاتا ہے، جس کی طرف قرآن دعوت دے رہا تھا، حق کے لغوی معنی سچ اور سچائی کے ہین، اور اپنے غور و فکر کے نتیجہ پر وثوق رکھتے ہوئے کہہ سکتا ہون کہ قرآن نے ہر جگہ یہی معنی لئے ہین، مگر سچ کا مفہوم اردو کے محاورہ کے مطابق نہین سمجھنا چاہئے، قرآن سچ سے مراد اپنی ذات یا منشا ہم ذات لیتا ہے، خدا کو "حق تعالٰی" کیون کہتے ہین، اس لئے کہ وہ ایک بلند اور ناقابلِ انکار صداقت ہے اس کے علاوہ بھی جو چیز اس بلند و برتر صداقت کا کوئی پہلو لئے ہوئے ہو گی، اسے بھی حق کہا جائے گا، ورنہ باطل اور فریب باطل، دنیا کے دو ہی پہلو تھے، حق اور باطل، قرآن بتاتا ہے، کہ آسمان و زمین سچائیون کے ساتھ

کیا انسان کا وجدان یہ باور کر سکتا ہے، کہ نظام ربوبیت کا یہ پورا کارخانہ وجود مین آجائے اور کوئی زندگی، کوئی ارادہ، کوئی قدرت، کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہ ہو، ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانہ ہستی کی ہر چیز مین ایک بولتی ہوئی پروردگاری اور ایک ابھری ہوئی کارسازی موجود ہو، اور کوئی پروردگار، کوئی کارساز موجود نہ ہو، پھر کیا یہ محض اندھی بہری فطرت، بے جان مادہ اور بے حس الکٹرون (برق پارون یا ذرات کہربائی، ابوالنظر رضوی) کے خواص ہین جس سے پروردگاری و کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور مین آگیا، اور زندگی اور زندگی رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہین، نظم بغیر ناظم کے، قیام بغیر کسی قیوم کے، عمارت بغیر کسی معمار کے نقش بغیر کسی نقاش کے، سب کچھ بغیر کسی موجود کے نہیں، انسان کی فطرت اپنی بناوٹ ہی میں ایک

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۱) پیدا کئے گئے ہین، تاکہ حقیقی صداقت کے جلوے اس سچ تک پہنچا دین، جس کے سوا سب کچھ جھوٹ اور دھوکہ ہو، انسان کی تخلیق ہی جب عبدیت کے لئے ہوئی ہے، تو ضروری تھا، کہ کائنات کے ہر ذرہ سے ایسی سچائیان نیک رہی ہون، جن کو محسوس کرکے وہ حق تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہو، ورنہ قدرت کو یہ حق نہین رہتا تھا، کہ ایمان بالغیب کا مطالبہ کرے، غیب پر ایمان اسلئے ضروری قرار دیا گیا، کہ خم کدۂ شہود کا ہر جام سچائیان چھلکا رہا تھا، اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی تشنگی فرو نہین کرتا، تو یہ اس کا قصور ہے، ساقی ازل کا نہیں، اگر مشہود شاہد کی طرف اشارے نہ کر رہا ہو، تو ایمان بالغیب کے قانون کا نفاذ ظلم ہوگا، دہی کفر حقیقی کفر ہے، جو سچائی دیکھنے کے بعد انکار کو نہ چھوڑے، ورنہ آقا کا کوئی اشارہ نہ پانے پر غلام کا نہ اٹھنا گستاخی اور گناہ نہین ہے اور نہ ہونا چاہیے،

حق کے بعض دوسرے معنی بھی علماء نے بتائے ہین، جن کو مولینا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی مین نزع کی بحث مین نقل فرمایا ہے، اور جس پر اپنے مضمون نظریہ موت اور قرآن" مین تنقید کر چکا ہون، بہرحال میرے نزدیک اگر حق کے معنی مین فلسفہ کا جزو نہ شامل کیا جائے تو مولینا سلیمان ندوی کی بحث بھی ختم ہو جاتی ہے، اور مختلف آیات سے بعض ایسے حقائق کا انکشاف بھی ہو سکیگا، جن پر بہت ہی کم لوگون کی نظر گئی ہے، یہان تفصیلی بحث کا موقع نہین اسلئے اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہون،

ایسا سانچہ لے کر آئی ہے، جس مین یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے، شک و انکار کی اس مین سمائی نہین، قرآن کہتا ہے، کہ یہ بات انسانی وجدان و اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظام ربوبیت کا مطالعہ کرے، اور ایک رب العالمین ہستی کا یقین اس کے اندر جاگ نہ اٹھے"

نظام ربوبیت کے مراحل سے رب العالمین کے پرجلال و جبروت دربار تک انسانیت اور تقاضا ہائے انسانیت کو پہونچا دینے کے بعد مولینا ابوالکلام نظام ربوبیت ہی سے توحید الٰہی، انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین، وحی و رسالت، معاد و آخرت، غرض کہ دفتر عقائد کے ایک ایک ورق کا مطالعہ کرانے کے بعد اس تصور عبدیت کی طرف نظام ربوبیت ہی سے رہنمائی کرتے ہین، جس کی نسبت "اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ" کے فقرہ سے قرآن نے حضرت یوسفؑ کی طرف کی تھی، اور جس نے شقاوت و بدبختی کی راہ سے اُن کو سعادت و پاکدامنی کی راہ پر لگا دیا تھا،

"جب وہ خدا کی ہستی کا ذکر کرتا ہوا اُسے "رَبّ" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، تو یہ بات کہ وہ رب ہے جس طرح اُس کی ایک صفت ظاہر کرتی ہے، اُسی طرح اس کی دلیل بھی واضح کر دیتی ہے، وہ رب ہے، اور یہ واقعہ ہے، کہ اُس کی ربوبیت تمھین چارون طرف سے گھیرے ہوے ہے، اور خود تمھارے دل کے اندر گھر بنائے ہوئے ہے، پھر کیونکر تم جرأت کر سکتے ہو کہ اُس کی ہستی سے انکار کرو؟ وہ رب ہے اور رب کے سوا کون ہو سکتا ہے، جو تمھاری بندگی و نیاز کا مستحق ہو،؟

آخر مین صرف ایک سوال باقی رہجاتا تھا کہ رب ربوبیت کی تخلیق کیونکر ہوئی، چنانچہ اس کا جواب دیتے ہوئے علماء و مفسرین کے اضمحلال ذہنی کا ماتم کرتے ہوئے نکتہ سنجی کی داد دیتے ہین قرآن کے وہ تمام مقامات جہان اس طرح کے مخاطبات ہیں، "یَا اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ

..... وغیرہ تو انھین مجرد امر و خطاب ہی نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ وہ "خطاب و دلیل" دونون ہین، کیونکہ رب کے لفظ نے "برہان ربوبیت" کی طرف خود بخود رہنمائی کر دی ہے افسوس ہے کہ قرآن کے عام مفسرین و مترجمین کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی، کیونکہ منطقی استدلال کے کے استغراق نے انھین قرآن کے طریق استدلال سے بے پروا کر دیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ ان مقامات کے ترجمہ و تفسیر مین قرآن کے اسلوب بیان کی حقیقی روح واضح نہ ہو سکی، اور استدلال کا پہلو طرح طرح کی توجیہات مین گم ہو گیا،

یہ حقیقت جس کی طرف مولینا نے اشارہ فرمایا ہے، کیا ایسی نہین جس کا مشاہدہ زیر بحث آیت ہی مین نہ ہو گیا، اتنا ہی نہین بلکہ اس بے بصری نے اہم ترین حقائق کا آج تک حل نہ ہونے دیا، روح کی حقیقت 'قرآن "امر ربی" کی بلیغ ترین ترکیب مین بتا چکا ہے، مگر علما، رب سے ربوبیت کا تصور نہ قائم کر سکنے کی بنا پر اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے، "نظریۂ موت اور قرآن" کے عنوان مین مین نے اس پر بحث کی ہے، کسی دوسری فرصت مین انشاء اللہ یہ مضمون بھی پیش کیا جائے گا،

شاید ترجمۃ القرآن کے کئی صفحات نقل کرنے پر شکایت پیدا ہو اس لئے گذارش ہے کہ اتنی عبارتین اسلئے نقل کرنی پڑین تاکہ ربوبیت کا مفہوم، نظام ربوبیت کی وسعت، تقویم انسانی کے جمالیاتی ارتقا، سے اس کا ربط و تعلق اور استدلالات ربوبیت کا مکمل خاکہ نگاہون کے سامنے آجائے اور یہ اندازہ کرنا آسان ہو جائے کہ مشاہدۂ ربوبیت سے حضرت یوسفؑ کا جمالیاتی احساس و تصور کیونکر اور کون سے مراحل طے کرنے پر تبدیل ہو سکتا تھا اور کہان تک ملکۂ علوم و حقائق، امتیاز حق و باطل اور عبدیت کے مطالبۂ وجدانی کو بیدار کر سکتا تھا، اور شاید ان صفحات کے نقل سے یہ مقصد حاصل ہو گیا ہو گا،

بہرحال یہان تک پہونچنے کے بعد اس کا اندازہ ہو گیا ہو گا، کہ برہان ربّ سے مراد برہان

ربوبیت ہے، اور برہان ربوبیت سے خدا، اسکی صفات، عالم معاد، اور عبدیت کے تمام تصورات ان ہی لمحات مین ہی پیدا ہو سکتے اور جبین عبودیت کو جھکا سکتے ہین، نہ صرف یہ بلکہ برہان ربوبیت کا اس نوع کی منطقیانہ دلیل ہونا بھی ثابت ہو گیا جس کا منصب وجبلت کی طرح مشاہدہ نہ کیا جا سکتا ہو،

دنیا آج سے ہزارون برس پیشتر ہی یہ تسلیم کر چکی ہے کہ مشاطۂ ازل نے عالم کبیر کا ایک نادر ترین نمونہ، حیات کے اوراق منتشر کا ایک شیرازہ بند اور حسن و رعنائی کے پھولون کا ایک مہک اٹھنے والا عطر تیار کیا ہے، جذب و انجذاب کا کوئی قانون، حیات و مرگ کا کوئی آئین، ماہ و انجم کا کوئی نظم و نسق، ظلمت و نور کی کوئی بوقلمونی اور انقلاب و خلود کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو خمکدۂ نمود کے کسی ساغر میں ہو اور اس پیکر جامعیت اور اس جام جہان نما مین نہ ہو، جس کو انسان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، زمین و آسمان کی وسعتوں میں جتنی سادگی و پرکاری، جتنا شعور و احساس، جتنا جمالیاتی تناسب اور نظامات ربوبیت کی جتنی گوناگونی آج تک علم و سائنس کی تحقیق میں آسکی ہے، ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں، جس کی لذت جس کی معنویت، جس کا ارتقا، اور جس کی پیچیدہ ساخت اپنی کوئی مثال انسان میں نہ رکھتی ہو، اس اعتبار سے دنیا کا کوئی پیکر جمیل جمال انسانی کا مقابلہ نہیں کر سکتا،

اگر کائنات کا نظام اور جمالیاتی ارتقا، ربوبیت کا احساس جذب کرا سکتا ہے، تو کیا ایک انسان کے جمیل ترین پیکر سے اس کی امید نہیں کی جا سکتی؟ فطرت کا ارتقا اور تناسب اور اس کی بوقلمونی دیکھنے کے لیئے عمر نوحؑ اور اس سے سبق آموزی کے لئے افلاطونی دماغ اور ابراہیمی فطرت چاہئے، لیکن ایک پیکر جمیل ایک جنبش نگاہ میں اس سے بہتر تناسب کا نمونہ پیش کر سکتا ہے، اور نظام ربوبیت کی نمایش سے ہر ملحد و انکار پیشہ

کی آنکھیں کھول سکتا ہے، کیا مخلوق سے خالق تک پہنچا دینے والی اس سے بہتر دلیل کہیں اور مل سکتی ہے؟ حسنِ مجاز، حسنِ حقیقت کا پرتو اور اس کا سایہ ہے،

اگر حسن کا ایک پیکر زیبا اور اس کی دلفریب کیفیتیں خدا کی صنعتِ ربوبیت کا نقشہ نہ دکھا سکیں اور اس کی الوہیت اور خالقیت کا اذعان نہ پیدا کر سکیں تو یقین کیجئے کہ پھر مظاہرات ربوبیت میں سے کوئی مظہر برہان ربوبیت کی حیثیت سے خدا کی پرستش کا تصور پیدا نہیں کر سکتا، مجھے کہنے دیجئے کہ اگر دل میں پاکیزگی اور لطافتِ احساس کا کوئی شائبہ اور حقائق پذیری کی معمولی استعداد بھی نہ ہو تو زلیخا کی طرح نگاہیں، نقطہ سے خط اور مثلث سے زاویہ تک نہیں پہنچ سکتیں، لیکن اگر انسان میں تھوڑی سی صلاحیت بھی ہے تو اپنے ارتقائی مدارج کے لحاظ سے ہر انسانی فطرت کم و بیش ضرور متاثر ہو کر رہے گی، انبیائے کرام کی فطرت میں جو استعداد ودیعت کی جاتی ہے، وہ اتنی پست، تاریک اور کثیف نہیں ہوتی کہ نگاہ عرفان کو ملزوم سے لازم تک، معلول سے علت تک، نظم سے ناظم تک اور مخلوق سے خالق تک نہ پہنچنے دیتی ہو، انبیائے کرام کی یہی وہ خصوصیت ہے جو دوسرے انسانوں سے ان کو ممتاز کرتی، اور عزم و عمل دونوں کے اعتبار سے پاکیزگی و عصمت کی برتری سپرد کر دیتی ہے،

یوسف و زلیخا کے ماجرے میں ایک طرف آرزو سے بھرا ہوا دل پہلو میں تڑپ رہا تھا، دوسری طرف حسن و جمال کا شاہکار، رعنائیوں کا مجسمہ اور جوانی کی بولتی ہوئی تصویر، خلوت و تنہائی کی فرصت کو دامن میں لئے کھڑی تھی، امید و بیم کی حالت میں محبت کی نگاہ بے ساختہ اٹھی، حسن کی کشش اور لذت و نشہ کا احساس ہوا اور قریب تھا کہ دست طلب دراز ہو اور حیوانیت ملکوتیت پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے قدم اٹھائے کہ خواب حسن نے کروٹ لی،

جذبات بیخودی میں انقلاب ہوا، اور وہ نگاہ جو نظام ربوبیت کی باریکیوں، لطافتوں اور حلاوتوں کو تلاش کر رہی تھی، دفعۃً اٹھی اور پروردگاری سے پروردگار تک پہنچ گئی اور یا تو ابھی انسانیت تماشاگاہ حیات و ربوبیت میں رنگ و نور کی دل آویز آمیزش کا تماشا دیکھ رہی تھی یا معاً بازیگر حیات کی قدرت و عظمت میں یکسر محو ہو کر رہ گئی، چشم انسانیت اٹھی تھی تماشائے جمال کے لئے اور جھک گئی بازیگر کے قدموں میں، یہ خدا کی نوازش تھی کہ مطالعۂ فطرت نے فطرت کے سرچشمہ تک پہنچا دیا، اس حقیقت میں کوئی ایسی پیچیدگی نہیں جس پر ایمان لانے کی غرض سے دور از کار تاویلات کی ضرورت ہو، کیا سائنس کی ایجادات دیکھ کر مغربی تحقیقات کی عظمت، آثار قدیمہ کو دیکھ کر قدیم شہنشاہیت کا جاہ و جلال اور اہم تصانیف دیکھ کر انکے مصنفین کی علمی جلالت کردار، نفسیات اور ذہنی معیار کا تصور روزانہ زندگی کا مشاہدہ نہیں ہے، اس دل آویز ماجرے میں خالق اکبر کی عنایت مہربانی کا پہلو صرف یہ تھا کہ وقت پر احساس و ادراک کے فقدان کا ماتم نہ کرنا پڑا، احساس ضمیر کی ایک ایسی امانت ہے جس سے کوئی محروم نہیں، مگر اس احساس کا وقت پر بیدار ہو جانا توفیقِ الٰہی کا محتاج ہے، یہی حیاتِ انسانی کی وہ احتیاج، قوت تمیز کی وہ بے بال و پری اور وجدان و شعور کی وہ بے مائیگی تھی جس کا مظاہرہ حضرت یوسف کے احساس و تمیز اور زلیخا کے عدم احساس کے ذریعہ کرکے کائنات انسانی کو سبق دیا گیا "لنصرف" والی آیت کا پارۂ رحمت اسی پہلو کو واضح کرنے کے لئے اضافہ کیا گیا تھا، تصور کو مادی ماحول سے بالاتر اور کثافتوں سے پاک کرنے کے لئے صرف مظاہرۂ ربوبیت ہی کافی نہیں ہے، اگر تنہا ربوبیت و پروردگاری کے مظاہرات، فطرت انسانی کی رہنمائی کر سکتے تو دنیائے انسانیت، مادہ پرستوں، گناہگاروں، اور "کالانعام بل ہم اضل" کے گمراہ

گلوں سے بھری ہوئی نہ ہوتی، چاند تارے، گل و بلبل، دامن کوہ کی سبز وادیاں، سمندر کی موجیں، آبشار کی اٹکھیلیاں، ابرِ بہار اور برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیاں جمالیاتی نمائش کے نمونے کون سی نگاہ کے سامنے نہیں پیش ہوتے، لیکن کتنے ہیں جو مجاز سے حقیقت اور ربوبیت سے ربِ اعلیٰ تک نگاہوں کو اٹھا سکتے ہوں، محض ربوبیت کبھی مجاز کا پردہ اٹھا کر حسن حقیقت کا چہرہ نہیں دکھا سکتی، بلکہ اس کے لئے براہ راست خدا کی رحمت و مہربانی چاہئے، رحمت و ظہور رحمت کی نشانیاں اگرچہ ہر تعبیر میں اعتدال اور تحسین و جمال کا دامن سمیٹے ہوئے ہیں، لیکن اس احساس کو بیدار کرنا جو مادی فطرت کی قید و بند سے آزاد ہو کر کارسازِ فطرت کی مشاطگی کا تماشا کر سکے، مناظر ربوبیت سے بالاتر فیضانِ رحمت کا محتاج ہے، تاریخ حیات کا ہر ورق "ما توفیقی الا باللہ" کا درس دے رہا ہے، اور اس درسِ عبرت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، جس طرح مادی ذرات کا باہمی تناسب و اعتدال ارتقاے ربوبیت کے منازل طے کرتا ہوا جمال و رحمت کو جذب کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، اسی طرح ایمان، عبدیت، خلوص اور قواے معنوی کا ہر سالمہ تناسب و اعتدال سے قریب تر ہوتے ہوئے اس جمالیاتی ارتقاء کی پابوسی کی اجازت حاصل کر لیتا ہے، جو رحمت الٰہی کو ابھار سکتا اور اپنی حیات و نمو کی طرف متوجہ کر سکتا ہو، رحمت کے لئے صرف تناسب و جمال میں کشش ہے، فرق یہ ہے کہ مادی جمالیت، مادی تعمیر و ارتقاء کے لئے رحمت کو کھینچتی ہے، اور معنوی و روحانی جمالیت، معنوی حیات و ارتقاء کے لئے، اگر معنوی جمالیت مضمحل، نامکمل اور کسی درجہ میں اعتدال سے دور ہو، تو اس کی جمالیاتی فطرت، مادی حسن و جمال سے کشش محسوس کرنے پر نہ حیات معنوی کو جمال روحانی سے تابندہ کر سکتی ہے، اور نہ تقاضا ہاے رحمت و توفیق کو بیدار کر سکتی ہے، کیونکہ رحمت کا خاصہ صرف جمال آفریں تناسب و اعتدال سے کشش

رکھتا تھا، جب تناسب و جمال ہی نہیں تو رحمت کو کیا تعلق؟ حضرت یوسفؑ کی عبدیت و اخلاص میں قواے روحانی کے اعتدال و تناسب نے حسن و جمال و دیعت کر دیا تھا، اس لئے ناممکن تھا کہ رحمت اُس حسین و جمیل عبدیت کو اپنی آغوش میں نہ اٹھا لے، خلوص و عبدیت میں جہاں بھی تناسب و اعتدال اور حسن و جمال پیدا ہو جائے سمجھ لیجئے کہ رحمتیں اسکو اپنی آغوشِ محبت میں لینے کے لئے تیار ہو چکی ہیں، یہ فطرت اللہ ہے اور اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، قواے معنوی کی لطافت ہمیشہ احساسات میں سماویت کے خواص پیدا کرتی ہے، اور کثافت مادی ماحول سے اٹھ سکنے کے لئے کوئی سہارا نہیں دیتی، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ نظریات کے علمی تناسب، سبزہ و گل کے نباتاتی تناسب، جواہرات کے غازیاتی تناسب، انسان کے شعوری اور وجدانی تناسب، اغذیہ کے کیمیاوی تناسب، موسیقی کے نغماتی تناسب اور کواکب و نجوم کے انجذابی تناسب میں جو ربوبیت و رحمت کی باریکیاں ہیں ان کو محسوس کر کے انسان پر حقائق کا دروازہ نہیں کھل سکتا، لیکن کیا ہر شخص کو ایک سیب کے گرنے، موج کے اٹھنے، پھول کے کھلنے اور نگاہ کے جھپکنے سے وہ راز معلوم ہو جاتا ہے، جو ڈارون، نیوٹن، آئن سٹائن، بیکن اور فلسفہ نفسیات و کیمسٹری کے دوسرے ماہرین نے معلوم کر لیا، اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا، ہر ایک کی طبعی استعداد اور اس کا ماحول اور شعوری ارتقاء یکساں نہیں ہو سکتا، حضرت یوسفؑ[1] کا ایمان، تقویٰ، عبادت اور اخلاص اُس نقطہ تک پہنچ گیا تھا جہاں سے حقائق مجردہ کا انکشاف اور رحمت کا نزول ہوتا ہے، اور زلیخا کا مادی حسن و جمال، قواے معنوی کے اُس اعتدال، ارتقاء اور جمال سے تہی دامن تھا، جو رحمت کی آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کر سکتا، اور اُسے اپنے معانقہ پر مجبور کر دیتا ہو، اس لئے ایک آسمان عصمت و اخلاص کا ستارہ بن کر چمکا، اور دوسرا شمع سحر کے ٹمٹماتے اور جھلملاتے

---

[1] ربّہٖ میں اپنے پروردگار کی تخصیص معنوی قوی کی اسی تربیت و عدم تربیت کا راز وا شگاف کرنے کے لئے کی گئی تھی،

ہوئے چراغ سے روشنی نہ پاسکا، ذالک تقدیر العزیز العلیم،

یہیں سے وہ نکتہ بھی حل ہو جاتا ہے جس کی بنیاد پر علمار نے مولانا ابو الکلام کے نظریہ کو رد کرتے ہوئے ایمان، عبادت اور قلبی کیفیت کو عمل اور کارکردگی پر ترجیح دی تھی، محض اعمال جو نیکی کا جامہ پہنے ہوئے ہوں رحمت الٰہی کے لئے کشش نہیں رکھتے، کیونکہ وہ ایک ایسی کھیتی کی طرح ہوتے ہیں جس کی سرسبزی، شادابی اور نشو ونما کو برف باری یا آندھیوں نے ختم کر دیا ہو اور اس سے حاصل خرمن مہیا کر سکنے کی طاقت سلب کر لی ہو" اگرچہ ایسے اعمال کا سبزہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے، لیکن اپنی غرض تخلیق کو کسی درجہ میں بھی پورا نہیں کر سکتا، اسی وجہ سے قرآن نے انھیں "حبطت اعمالھم" سے تعبیر کیا، اور درجۂ اعتبار سے گرا دیا ہے، اعمال جب تک تمام اجزائے ایمان اور ان ہیئیاتِ عبادت کے ساتھ نہ ہوں جسے خلوص، عبدیت، ارتقائے روحانی اور دیگر ہیئیات نفسانیہ نورانیہ کی تخلیق و تعمیر کے لئے وحی والہام نے بتایا ہے، اس وقت تک نہ روح میں وہ اعتدال و تناسب جذب کیا جا سکتا ہے جو جمالِ معنوی کے مکمل ارتقار کے لئے ضروری ہے، اور نہ جمالِ معنوی کا مضراب، رحمتِ الٰہی کے ساز کو چھیڑ سکتا ہے، اگر اجزائے ایمان کا تعین اور عبادت کی خصوصی اشکال، ہیئیات روحانیہ سے کوئی خاص نسبت نہ رکھتیں، تو وحی ربوبیت کو "اسوہ حسنہ" کے لباس میں خضرِ راہ بننے کی ضرورت نہ ہوتی، آخر یہ سارا دفتر بے معنی جو قرآن، حدیث اور فقہ میں بکھرا پڑا ہے، کیا اس درجہ فضول تھا کہ بغیر اس کے محض "تمام مذاہب کے" مسخ شدہ احکام کافی ہو سکتے تھے، اور ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر رہتے ہوئے نجات رضائے الٰہی اور ارتقائے روحانی حاصل کر سکتا تھا، بہرحال اس نکتہ کی وضاحت فرصت چاہتی ہے، اس لئے موضوعِ بحث کی حد تک اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہو گا، کہ حضرت یوسف کو مادی تصورات کی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لئے

رحمت کی کارسازی اور توفیق ایزدی امداد کر رہی تھی، ورنہ وہ بھی زلیخا کی طرح مظاہرات ربوبیت کے تماشے ہی میں محو ہو کر رہ جاتے، یہی وہ اہم حقیقت تھی جس کو قرآن نے ربوبیت و رحمت کے تاریخی پہلو سے دکھا کر کائنات انسانی کو بہترین سبق دیا تاکہ وہ خلافتِ ارضی اور انسانی ارتقار کا اسی طرح مستحق قرار پا سکے، جس طرح حضرت یوسف قرار پائے اور قدرت نے اپنی بے پایاں نوازش سے ان کو سرفراز کیا،

اگرچہ اصولی گفتگو کی حد تک دائرہ بحث میں اب کوئی گنجایش نہیں رہی، لیکن حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کرنے کے لئے بعض ان جزئیات و تفصیلات پر بھی مختصر الفاظ میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے، جو مضمون کے دوسرے حصہ میں مولانائے محترم نے بیان فرمائی ہیں، یہ ظاہر ہے کہ میری بحث و گفتگو خالص علمی ہے اور وہ بھی کلام الٰہی کی روشنی میں، اس لئے مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ میری معروضات کو کسی دوسری نظر سے دیکھا جائیگا، اور میری نیت کے بارہ میں کوئی اشتباہ کیا جائیگا۔

(۱) حضرت یوسف نے "اِنَّ رَبِّیْ اَحْسَنَ مَثْوَایَ" اس لئے نہیں فرمایا تھا کہ زلیخا "معاذ اللہ (پناہ بخدا) کی باریک حقیقت کے سمجھنے سے سردست (یعنی غلبۂ جذبات میں) قاصر تھی، "کفر و معصیت حقائق کا ذہنی احساس نہیں مٹاتے بلکہ محض قلوب پر مہر لگا دیتے ہیں اور وجدان کے ذریعہ عمل کو زندہ نہیں ہونے دیتے، جیسا کہ خود قرآن شاہد ہے کہ کفار منکرین کی صف میں ہونے کے باوجود بھی یعرفون کما یعرفون ابناءھم (ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے کہ اپنے بال بچوں کو) کے مصداق تھے، دوسرے ایک پیغمبر کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ اپنے مرتبہ سے اتنا پست ہو جائے اور وہ بھی برہان ربوبیت کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہ اس کی نگاہیں رب اعلیٰ سے ہٹ کر رب ادنیٰ پر جم جائیں، خواہ اس کی تاویل کچھ ہی کیوں نہ کی جائے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ وہ رب ادنیٰ کو اذیت پہنچانا بھی رب اعلیٰ ہی کی نافرمانی یقین کرتے تھے، اس لئے اس مذہبی خلق کا مظاہرہ کیا،

چنانچہ ربِ ادنیٰ کے احسانات کا تذکرہ کرنے سے پہلے بھی خدا سے پناہ مانگتے ہیں اور تذکرہ کے بعد
بھی فلاح یاب نہ ہو سکنے کے قانون الٰہی کو پیش کرتے ہیں، مقصد یہ تھا کہ ربِ ادنیٰ کی احسان فراموشی
خدا کا گناہ اور فلاح کے قانونِ فطرت کے خلاف ہے، اس لئے میں ایسی چیز نہیں کر سکتا، ان کا ذہن
عام انسانی فلسفۂ اخلاق کے آستانہ پر سجدہ نہیں بلکہ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے حقائق
کا مشاہدہ کر رہا تھا، اور اسی روحانی تاثر کے توسط سے وہ زلیخا کی اخلاقی حس کو بیدار کرنا چاہتے
تھے، یہ آیت ہرگز دو الگ الگ باتوں پر مشتمل نہیں جو مذہب اور اخلاق سے وابستہ ہوں، اور تنہا
مذہب سے نہیں بلکہ اسی ایک بات پر مشتمل ہے، جس کا مشاہدہ برہان ربوبیت کے ذریعہ ہو چکا تھا،
یعنی ربِ اعلیٰ کی ہستی، اس کی قدرت و عظمت اور الوہیت کا اذعان اور اذعان کا پیدا کردہ تصور
عبدیت، مگر اس سے صرف عملی عصمت ثابت ہوتی ہے، عصمتِ عزم و ارادہ اور عصمتِ تصوری کا
ثبوت فراہم نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمام گفتگو برہان ربوبیت کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہوئی تھی، جیسا کہ خود قرآن کا انداز بیان بتا
رہا ہے، اور ہم جس معنی سے بحث کر رہے ہیں وہ مشاہدہ برہان ربوبیت سے پہلے کا ہے اسلئے ان تمام تفصیلات کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(۶) "صرف" کے معنی اگر حفظ ہی کے لئے جائیں تو بھی اس میں کچھ ہرج نہیں، کیونکہ زمانہ کی گردش
سے کسی کو "محفوظ" رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زمانہ اس کے لئے گردش ہی نہیں کریگا، بلکہ گردشِ ایام کے
نتائجِ بد سے ہستی کو محفوظ رکھے گا، اگر کوئی شخص محاذِ جنگ سے زندہ واپس آجائے تو اس کے یہ معنی
تو صحیح ہیں کہ اس کی جان بچ گئی، مگر یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ اس کے کان کے پاس سے سنناتی ہوئی
گولیاں نہیں گذری تھیں، ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ وہ اس خیر و شر کی جنگ میں اپنی پیغمبرانہ حیثیت
کو محفوظ نہ رکھ سکے تھے بلکہ صرف یہ ہے کہ گولیاں کانوں کے پاس سے سنناتی اور لرزش
کا خفیف احساس (جو طبیعت انسانی کا ایک خاصہ ہے) پیدا کرتی ہوئی گذر گئی تھیں، اور
ابھی تک کوئی ایسا قلعہ نہیں تیار کیا جا سکا تھا جو ہماری "کہربائی موجوں" کی اثر اندازیوں کو ناکام

بنا سکتا ہو،

(۳) "شیطانی اغواء" گمراہ کر دینا ہے، ہم یہ کہتے ہی کب ہیں کہ وہ غلط راستہ پر چل پڑے
تھے، ہمارا کہنا تو فقط یہ ہے کہ ان کے دل میں اتنا خیال پیدا ہوا اور رفع ہو گیا کہ مجھے ادھر
چلنا چاہئے یا نہیں، فطرتِ انسانی کا ذہنی تذبذب اور وہ بھی چند لمحہ "اغوا" نہیں کہلایا جا سکتا۔
اخلاقی روح کی بیداری کے طبعی وقفہ میں اگر فطرت انسانی کا تقاضا اپنا کام کر لے تو یہ اغوا نہیں
بلکہ "انسانیت" کہلائی جائے گی،

(۴) "صبو" کے معنی تصور یا اس میل طبعی کے نہیں جو انسانی فطرت سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔
بلکہ رغبت، خاص دلچسپی، محبت کا ایک خاص درجہ اور جذبات کا کسی ایک سمت جھک جانا ہیں،
اس اعتبار سے حضرت یوسفؑ یقیناً بے گناہ رہے مگر اس سے انسانی تصور اور فطری رجحان کے
حدود تک انکار و نفی کا ثبوت کس طرح فراہم ہو گیا،

(۵) خیانت کا اتہام حضرت یوسفؑ پر ہمارے نقطۂ نظر سے بھی ہرگز نہیں لگایا جا سکتا، اول
تو انھوں نے نہ کچھ چرایا اور نہ اپنے لئے چھپایا، ہر چیز اپنی جگہ پر رہی، دوسرے ہم تو یہاں تک
کہنے کو تیار ہیں کہ ان کے ذہن میں خیانت یعنی دوسرے کی ملکیت پر تصرف کا ارادہ تو رہا ایک طرف اسکا
خیال بھی نہیں آیا، بلکہ جس حد تک حسن و جمال کسی کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتا بلکہ قدرت کا دستِ
تصرف اس پر اختیار رکھتا ہے اس حد تک ضرور ان کے ذہنی اور وجدانی تموجات نے حصہ لیا تھا
مگر جب پروردگاری سے پروردگار اور پروردگار سے اس کے معنوی قوانین ربوبیت تک ان کی
نگاہ پہنچی تو خود وہ آزاد و بے باک انسانی تصور بھی اپنی موت مر گیا جو سب سے پہلے ان کے ذہن
میں آیا تھا، اور بغیر کسی خیانتِ مجرمانہ کا سہارا لئے ہوئے، اس عقیدہ میں کیا ہرج ہے، اور آیت
سے اس کی منافات کہاں ٹپک رہی ہے،

(۶) "رویت" کے معنی چونکہ عینی مشاہدہ کے ہمارے علماء اور مفسرین کے ذہن میں نہ آسکے، اور
اگر آئے تو گناہ کی ناپاکیاں لئے ہوئے، اس لئے خواہ مخواہ عقلی مشاہدہ جو رویت کے بعید ترین معنی
ہیں اور قرآن کے محتاج تک ان کے شاعرانہ خیال نے پرواز کی اور اس پرواز خیال نے ایسی
الجھنوں اور دور از کار تاویلات میں پھنسا دیا کہ ان سے باہر آسکنے کے لئے مولانا حفظ الرحمن صاحب
کو سخت کوشش کرنا پڑی، حالانکہ "دست بہ سنگ آمدہ" کی رگہائے نبض میں ابھی تک خون جما ہوا ہے،
اور خطابت کی آتش سیال اُن میں کوئی حرکت پیدا نہ کر سکی، مشاہدہ عقلی تسلیم کر لینے کی صورت میں
ان تمام روایات اور تاویلات میں سے کسی ایک کو بھی ٹھکرانے اور کسی ایک کو بھی حقیقت فرض
کر لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، جن کو مولٰنا نے تسلیم کیا اور جن سے انکار
کیا ہے،

(۷) اِلہام ربی کی تفسیر پچھلے صفحات میں رحمت و ربوبیت کے نام سے گذر چکی ہے
اور شاید مجھے یہ عرض کرنے کا حق دیا جائیگا کہ اس سے بہتر تفسیر کسی دوسرے پہلو سے نہیں کیجا سکتی،
لہذا اس آیت کو ہمارے منشا اور ہمارے نظریہ کے خلاف استشہاد میں پیش نہیں کیا جا سکتا،

اگر اتنی تفصیلات و دلائل کے باوجود بھی مضمون نگار مطمئن نہ ہو سکے ہوں، تو شاہ ولی اللہ صاحب
کی تصنیف "تفہیمات الٰہیہ" جلد اول صفحہ ۲۶۵ پر اس آیت کی وہ تفسیر ملاحظہ فرمائیں، جس سے حرف
بحرف میرے نظریہ کی تائید ہوتی ہے، فرماتے ہیں،

اعلم ان عصمة الله لعباده من السوء	جاننا چاہئے کہ خدا اپنے بندوں کو بدکاری
والفحشاء يكون على وجهين احدهما	اور فحشی سے دو طریقوں سے محفوظ رکھتا ہے،
ان تتلون نسمته بلون التقوى وذلك	ایک یہ کہ اسکی روح تقوی کے رنگ میں
بان يستمع الى زواجر الله تعالى ووعيده	رنگ جائے، اور یہ اس طرح کہ خدا کی

فتقع على القلب بموقع عظيم وتظهر	روک ٹوک اور اس کے تہدیدی احکام کو سنے اور
مكنون جبلته من خلق الديانة	دل پر اس کا سخت اثر ہو اور اس کے ذریعہ
فيحيط التقوى بالنسمة من جميع	سے اس کی مخفی فطرت یعنی خلق دیانت ظاہر
جوانبها ثم يدخل في جذرها فينعدم	ہو اب تقوی روح کے تمام اطراف کا احاطہ
ملكة المعصية رأسا وهذه	کرلے پھر اسکی جڑ میں پیوست ہو جائے اور
عصمة العليين واهل الله اعني	گناہ کا ملکہ بالکل فنا ہو جائے یہ اہل اللہ
الذين يكون محتد قربهم من الله	کی معصومیت ہے یعنی ان لوگوں کی جن کے
هو الاعمال او ملكاتها والثاني ان	تقرب الٰہی کی اصل صرف اعمال یا ان کے
لا تتلون نسمته بشيء من اللونين	ملکات ہیں، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسکی روح
لا لون التقوى ولا لون الفجور	پر کوئی رنگ نہ چڑھا ہو نہ تقوی کا رنگ
بل يكون خالية صافية متهيئة	نہ بدکاری کا رنگ بلکہ وہ بالکل خالی اور
لما يرد عليها من ظهور احكام التجليات	صاف ہو اور خدا کی گوناگوں تجلیات جو
الالهية المتنوعة القائمة على	اُس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی ہیں ان کے
عينه من التولي وفيضان الشرائع	احکام کے ورود و ظہور کے لئے تیار ہو یعنی
والصير ورته من جوارح الله والسنته	روگردانی احکام شریعت کے فیضان اور خدا کے ہاتھ
كما قال رسول الله صلعم الحق	پاؤں اور زبان بننے کیلئے اسمیں آمادگی و استعداد باقی
ينطق على لسان عمر"	ہے جیسا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ حق عمر کی زبان
	سے بولتا ہے"

. . . .

ولكن يحيط بهذا الرجل الاسم الذي	لیکن اس شخص کا احاطہ وہ نام کرتا ہے جو

یقتضی تولی العبد من فوقه ومن تحته فلا یدعه ان یقع فی مهلكة وان كانت ملكات السوء موجودة فیه لعموم حاله وشیوع تطوره فی الاطوار اذ الباطل لا یخلو من نشأة توجیه وتحققه بحسب طبیعتها وانما هی خیر بحت فی حد ذاتها وان انقلب حكمها شرًا فی هذا الموطن لفساد القابل فالعبد حینئذٍ غیر متلون بلون ولا مقید بالتقوی بحسب جذر سره ولكن التقوی لباس الله من فوقه وهذه عصمة اصحاب التجلیات من الله وهذه اشرف من الاولی واكمل وابهی وكان یوسف علیه السلام بل الانبیاء جمیعها من المعصومین بهذه العصمة ولذلك تراهم یحولون فی المباحات من معانقة الازواج

بندے کی روگردانی کو اس کے اوپر اور نیچے سے چاہتا ہے اسلئے وہ اس کو ہلاکت میں پڑنے سے روکتا ہے اگر اس میں بدکاری کے ملکات موجود ہوتے ہیں کیونکہ اسکو ہر قسم کے حالات سے گذرنا پڑتا ہے کیونکہ باطل کی بھی ایک پیدائش ہوتی ہے جس سے اس کا وجود ضروری ہوجاتا ہے اور وہ بذات خود خیر محض ہے البتہ اس مقام میں قبول کرنے والے کی خرابی سے اس کا حکم برا ہوجاتا ہے، اس بنا پر اس وقت بندہ پر کوئی رنگ نہیں چڑھا ہوتا اور نہ وہ اپنی اصل فطرت کے رو سے تقویٰ کا پابند ہوتا البتہ تقویٰ اس کے اوپر سے خدا کا لباس ہوتا ہے خدا کی جانب سے اصحاب تجلیات کی معصومیت یہی ہے اور یہ پہلی معصومیت سے زیادہ اشرف، اکمل اور روشن ہے، حضرت یوسف علیہ السلام بلکہ تمام انبیا اسی معصومیت کے رو سے معصوم تھے، اسی لئے تم دیکھتے ہو کہ وہ مباحات یعنی بی بیوں اور بچوں کے معانقہ، پیشہ و جائداد، بچوں کے مرنے

والاولاد والمكاسب والضیعات والبكاء علی فقد الاولاد والمرافق والضجر علی المرض وسوال كشفه ما لا یفعل عشره الصوفیون المقیدون الذین فنیت نسمتهم فی تطلع الملكوت والجبروت فاقبلت همتهم بجامعها الی وراء الحیوة الدنیا فصار لا یمیز بین الجدار والمرأة واخس العیش وناعمه وفاضل بحسب حاله یا حبذا المكروهان الموت والفقر وبالجملة فكان یوسف علیه السلام شابًا سوی المزاج والمرأة من اجمل الناس مشغوفة بحبه فعرضت نفسها علیه وتجملت كل التجمل وراودته عن نفسها وغلقت الابواب فاوجبت صحته مزاجه الناسوتی ان

اور فوائد کے ضائع ہونے پر گریہ و بکا، مرض پر اظہار کرب و تکلیف اور اس کے زائل ہوجانے کی دعا کرنے سے گریز نہیں کرتے، اور یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کا عشر بھی وہ صوفی نہیں کرتے جو پابند تقویٰ ہیں اور ان کی روح ملکوت اور جبروت کے مشاہدہ میں فنا ہوگئی ہے، اس لئے ان کی پوری ہمت ان چیزوں کی طرف متوجہ ہے جو دنیوی زندگی سے تعلق نہیں رکھتیں پس وہ لوگ دیوار اور عورت میں اور اچھی اور بری معیشت میں امتیاز نہیں کرتے اور اپنی حالت کے لحاظ سے کہتے ہیں کہ دو مکروہ چیزیں یعنی موت اور احتیاج کس قدر خوشگوار ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام جو ایک قوی جوان تھے اور عورت جو نہایت حسین تھی ان پر فریفتہ تھی، اس نے خوب بن سنور کر اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کرکے ان کو اپنی طرف مائل کیا اور دروازے بند کردیئے اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے

یھم بھا ولکن ادرکتہ التوفی	انسانی مزاج کی صحت نے ان کو اسکی طرف مائل
فتمثل عندہ بصورۃ البرھان	ہونے پر آمادہ کیا لیکن خدا کی حفاظت پہنچ گئی
الذی رأہ واخلصہ اللہ تعالیٰ	اور انکے پاس اس دلیل کی صورت میں مجسم ہوکر
وکذالک صنیعہ تعالیٰ	آئی جس کو انھوں نے دیکھا اور خدا نے انکو بچا لیا
بالمخلصین یا لفتح فتد برو	اور خدا مخلصین کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتا ہے
کن من المثبتین،	تو سوچو اور ثابت قدم لوگوں میں سے ہو،

مجھے اُمید ہے کہ میری یہ مختصر گذارشات میرا نقطۂ نگاہ واضح کرنے کے لئے کافی ہونگی اس لئے اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں اگر کسی صاحب نے علمی پیرایہ میں اس پر تنقید کرکے قرآن کی خدمت انجام دینا پسند کیا تو مجھے بھی دوبارہ قلم اٹھانے اور اُن علمی گوشوں پر روشنی ڈالنے میں کوئی عذر نہ ہوگا جو ابھی تک تفسیر و بیان کی تشنگی رکھتے ہیں ورنہ معذور سمجھا جائے،

دولتِ عثمانیہ جلد اوّل

یہ مسلمانوں کی زندہ حکومت ترکی کے عروج و زوال اور جمہوریۂ ترکی کی مفصل تاریخ ہی، پہلے حصہ میں عثمان اول سے مصطفیٰ رابع تک پانچ صدیوں کے مفصل حالات ہیں، اردو میں ابتک ترکی حکومت کی اس سے زیادہ مبسوط اور مستند تاریخ نہیں لکھی گئی از مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے رفیق دار المصنفین، ضخامت ۴۹۰ صفحے، قیمت ۳ے،

رہنمائے تاریخ اردو،

مولفہ جناب حاجی محمد عبد القادر صاحب ریٹائرڈ وکیل بنارس

اس کتاب میں مختصر تاریخ اردو و قواعد تاریخ اردو مع تمثیلات مشہور و معروف شعرائے اردو و تذکرہ شعرائے اردو تاریخ ہا و وفات سلاطین ہند وغیرہ درج ہیں، حجم ۱۵۲ صفحے، قیمت ۱۲/۱ر " منیجر "

مسئلہ اصلاحِ تعلیم

نفسیاتی اصول پر

از مولانا عبد السلام ندوی

(۳)

قوت ارادی اور عزم صادق کی نشوونما اکثر حالات و واقعات میں یہ دونوں خلق موروثی ہوتے ہیں، لیکن بایں ہمہ تربیت تھوڑا بہت ان کو ترقی بھی دے سکتی ہے اور یہ ترقی صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب طالب العلم کو ایسے مقامات میں قیام کا موقع ملے جہاں مجبوراً اس کو پختہ اراد کرنا پڑتا ہے، اور ساتھ ساتھ اس ارادہ پر بغیر کسی کمزوری کے عمل بھی کرنا پڑتا ہے "بلاکی" نے شاعر "وردوت" کے متعلق بیان کیا ہے، کہ اس نے ایک دن پہاڑ پر چڑھنے کا پختہ ارادہ کیا لیکن آندھی آگئی، بایں ہمہ وہ اپنے ارادہ سے باز نہ آیا، اور یہ اعلان کیا کہ آدمی نے جس چیز کا پختہ ارادہ کر لیا اس کے متعلق کسی رکاوٹ کی وجہ سے رائے کی تبدیلی اخلاق کے لئے کچھ نہ کچھ خطرناک ضرور ہے، انگریز پختہ ارادے والے آدمیوں کو نہایت پسند کرتے ہیں، اور انکی محبت اور تعظیم کرتے ہیں، خواہ ان کی قومیت کچھ ہی ہو،

اسی خلق کی کمی کی وجہ سے فرانسیسیوں نے اخیر جنگ میں شکست کھائی، کیونکہ ان کے پاس ایک ایسی فوج موجود تھی جس میں شجاعت اور ذہانت کی کمی نہ تھی، صرف یہ نقص تھا کہ پختہ ارادہ، قوتِ اختراع اور خود اعتمادی کا جوہر اس میں موجود نہ تھا، اس کے بخلاف جرمن

افسروں میں یہ تمام اوصاف نہایت شدت کے ساتھ پائے جاتے تھے،

نوآبادیوں کے بچوں کی تربیت ہم نے اپنی تعلیم کے بدترین طریقے ان نوآبادیوں میں منتقل کئے جن پر ہم حکمراں ہیں اسلئے لازمی طور پران سے بدترین نتائج نکلے، موسیو پول جیران نے جو چینی ہندوستان کے حاکم تھے تعلیم کے وہ طریقے بتائے ہیں جن کے مطابق نوآبادیوں میں تعلیم دینی چاہئے، ان کے یہ الفاظ حسب ذیل ہیں،

"تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نوآبادیوں پر حکومت کرنے والی قوم بالخصوص فرنچ قوم نوآبادیوں کی تربیت میں ناکام رہی کیونکہ ایک قوم کا دوسری قوم کو تربیت دینا اسی وقت نتیجہ خیز ہوسکتا ہے جب تربیت دینے والی قوم اپنے مخصوص اور بلند آئیڈیل کو بالکل بھول جائے اور تربیت حاصل کرنے والی قوم کے سامنے ایک ایسا آئیڈیل پیش کرے جو اس کے آئیڈیل سے بہت کم بلند ہو، ہم نے یہ اعتقاد قائم کرلیا ہے کہ تمام پست درجہ کی قومیں ہمارے مشابہ ہیں، اس لئے ہم نے ان قوموں کو بھی اسی طرح تربیت دینا شروع کی جس طرح خود اپنے آپ کو تربیت دیتے ہیں، اور ان کے سامنے اپنے مخصوص اجتماعی مقاصد رکھ دیئے، اس لئے ہم نے ان قوموں کے اخلاق و عادات، ان کی نفسیت اور ان کے مختلف نظامہائے زندگی میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کردی اور ایک ایسی تبدیلی پیدا کرنی چاہی جو ناممکن تھی، ہم نظام کو بدلتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم عقل کو بدلتے ہیں، ہم تعلیم کے ذریعہ سے عقل پر اثر ڈالتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا اثر اخلاق پر پڑ رہا ہے، ہم نتیجہ پر اثر ڈالتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ علت پر اثر پڑ رہا ہے، گویا ہم عمارت کو اوپر سے بنانا چاہتے ہیں اور اس طرح سے قدرت کی روش میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں، اور اس سے صرف سلبی نتائج پیدا ہوتے ہیں

متمدن قوموں کو یقین ہے کہ تعلیم کو تربیت کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے لیکن تعلیم کا نظام قوت حافظہ پر قائم ہے جو دماغ کو معلومات سے بھر دیتا ہے، اور کبھی کبھی قوت فیصلہ پر بھی اس کا اثر پڑ جاتا ہے، لیکن اخلاق پر اس کا اثر بہت کم یا بالکل ہی نہیں پڑتا، کیونکہ اخلاق اور قوت حافظہ میں اور منطق اور اخلاق میں باہم کسی قسم کا تعلق نہیں، اخلاقی تربیت پر صرف اسوۂ حسنہ اور ماحول کا اثر پڑتا ہے، ایک اور بات بھی ہے جس سے پست درجہ قوموں کی تربیت میں متمدن قوموں کی غلطی اور بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے کیونکہ وہ ان قوموں کی تربیت میں تعلیم پر بھروسہ کرتی ہیں، اور تعلیم بھی وہ جو خود ان کی یورپین زبانوں میں دی جائے لیکن یہ ایک یقینی بات ہے، کہ یہ یورپین زبانیں نوآبادیوں کے رہنے والے لوگوں کی عقل سے بالکل الگ تھلگ ہوتی ہیں، اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ زبان اور اس زبان بولنے والی قوم کے دماغ کی ساخت میں نہایت قوی تعلق ہوتا ہے، اور چونکہ عقل میں زمان و مکان کے اختلاف کی وجہ سے ہمیشہ ایک مستقل تغیر ہوتا رہتا ہے اسلئے زبان پر بھی اس تغیر کا اثر پڑتا رہتا ہے، اس بنا پر فرنچ زبان ہندوستانیوں کی عقل کے ساتھ میل نہیں کھاتی بلکہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ایسے معانی پر دلالت کرتے ہیں، جو بظاہر تمام قوموں میں مشترک ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ بالکل مختلف ہوتے ہیں، مثلاً حسن و جمال کا جو آئیڈیل فرانسیسیوں کے یہاں ہے وہ حسن و جمال کے اُس آئیڈیل سے بالکل مختلف ہے جو ایشیائی اور افریقی قوموں کے یہاں پایا جاتا ہے، اسی طرح عیسائیوں کے نزدیک نیکی کی محبت کا جو معیار ہے، وہ اُس معیار سے بالکل مختلف ہے جو ہندؤوں اور مسلمانوں کے یہاں پایا جاتا ہے، ہر زبان میں جو کتنی ہی ترقی یافتہ یا کتنی ہی زوال پذیر ہو، ایسے خیالات اور معانی پائے جاتے ہیں جن پر ایسے الفاظ دلالت کرتے ہیں جن کو صرف اس زبان کے بولنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں، اور دو زبانوں کے الفاظ جس قدر مختلف ہوتے ہیں اسی قدر ان

خیالات ومعانی میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، اس لئے اگر ہندوں کو فرنچ زبان میں تعلیم دی جائے تو وہ علمی مسائل کو فرانسیسیوں کی طرح نہ سمجھ سکیں گے، بلکہ وہ اسی طریقہ کے مطابق سمجھیں گے جس کے وہ بچپن سے خوگر ہو چکے ہیں، وہ الفاظ تو فرنچ زبان سے مستعار لیں گے، لیکن ان کی دلالت اپنے معانی پر کروائیں گے،

غرض تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ تربیت جب تک اخلاق وعادات وغیرہ کے مناسب نہ ہوگی اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، اس بنا پر نوآبادیوں کی تربیت بالخصوص تعلیم کے معاملہ میں بھی ہمکو اسی اصول کا لحاظ رکھنا چاہئے، اور اسی تعلیم کو ان نوآبادیوں کے حالات اور اخلاق وعادات کے مناسب ہونا چاہئے، اور اس حیثیت سے جب ہم ان نوآبادیوں کے معاملات پر غور وفکر کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ صرف ابتدائی تعلیم ان نوآبادیوں کی ضروریات کے لئے کافی ہے، اور ان کو سکنڈری تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ ان کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتیں، ان نوآبادیوں کو فلسفہ، قانون، سیاست اور اخلاق سے محفوظ رکھنا چاہئے، صرف ابتدائی اور صنعتی تعلیم پر قناعت کرنا مفید ہوگا، بلکہ صنعتی تعلیم کی ترقی میں بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہئے، اور صرف انہی صنعتوں کی تعلیم دینی چاہئے جن کی یہ نوآبادیاں محتاج ہیں، یعنی زرعی تعلیم زراعت پیشہ ملکوں میں اور صنعتی تعلیم صنعت پیشہ ملکوں میں دینی چاہئے، بلکہ اس میں بھی معتدل روش اختیار کرنی چاہئے، اور گرم ملک والوں کو معتدل ممالک کی زراعت کی تعلیم نہیں دینی چاہئے، اس میں اعتدال سے کام لینا چاہئے اور زراعت وصنعت کے جن طریقوں کے وہ لوگ خوگر ہوں ان میں سکون اور لطف وکرم سے تغیرات پیدا کرنے چاہئیں، اگر ہم زراعت اور صنعت کے ایسے طریقے ان کو سکھانا چاہیں جن کے وہ خوگر نہ ہوں تو ہمیں نرمی اور اعتدال کے ساتھ کام لینا چاہئے، اور اسی اصول پر ان نوآبادیوں مثلاً انام اور عرب

میں بھی کام لینا چاہئے جن میں متمدن قومیں آباد ہیں، کیونکہ ان قوموں کو انجنیروں اور ڈاکٹروں کی ضرورت نہیں ہی، بلکہ وہ ہر چیز سے پہلے کاشتکاروں اور مزدوروں کے محتاج ہیں، ان مراتب کے طے کر لینے کے بعد جب وہ وقت آئے کہ ایک طویل مدت کے تغیرات کے بعد یہ قومیں سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے قابل ہو جائیں تو ہمکو انھیں یہ تعلیم دینی چاہئے، لیکن ہر چیز میں ہمکو اسراف سے بچنا چاہئے،[1]

تربیت پر فوجی خدمت کا اثر گذشتہ بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ عزم وثبات، قوت ارادی اور ضبط نفس، اور مصائب کے برداشت کرنے کی قوت، جدت واختراع غرض اس قسم کے

---

[1] ڈاکٹر لیبان جیسا فلسفی بھی اس بحث میں اپنی عالمانہ پوزیشن کو قائم نہ رکھ سکا، بلکہ وہ بالکل ایک سیاسی آدمی بن گیا، لیکن اس وقت ہم کو اس سے بحث نہیں ہے کہ وہ علم کو نوآبادیوں پر یا نوآبادیوں کو علم پر ترجیح دیتا ہے، کیونکہ وہ ایک فرنچ فلسفی ہے اور فرانس ہی کے فائدے کی بات کہتا ہے، اور اس میں کبھی غلطی کرتا ہے، اور کبھی صحیح روش اختیار کرتا ہے، بلکہ ہم ناظرین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ اوس نے نوآبادیوں کی تعلیم کے جو طریقے بتائے ہیں اون کو فرانسیسیوں اور فرانسیسیوں کے علاوہ دوسری قوموں نے بھی اختیار کیا ہے، اور ناکامیاب رہی ہیں، چنانچہ مصر اور مصر کے علاوہ دوسرے ممالک کی حالت کا اس حیثیت سے مطالعہ کیا جاسکتا ہے، اصلی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ نوآبادیوں میں کون سا طریقہ تعلیم رائج کرنا چاہئے، بلکہ اصلی مسئلہ خود نوآبادیوں کے وجود کا ہے، ڈاکٹر لیبان وغیرہ دو متناقض اصول میں جن کی تطبیق ناممکن ہے تطبیق دینا چاہتے ہیں، یعنی ایک اصول تو نوآبادیوں کے وجود کا اور دوسرا اصول تمدن وتہذیب کا ہے، ان میں نوآبادیوں کے اصول کے لئے ذلت اور غلامی لازمی چیزیں ہیں، اس کے برخلاف تمدن وتہذیب کے لئے آزادی اور استقلال لازمی ہیں، طاقتور قوموں کو کتنا ہی اقتدار حاصل ہو جائے لیکن آج یا کل کسی نہ کسی دن نوآبادیوں کے وجود کی ناکامیابی کا اقرار کرنا پڑے گا، کیونکہ حالات زندگی بدل گئے ہیں، اس لئے خود یہ طاقتور قومیں ان نوآبادیوں سے اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھا سکتیں جب تک اُن میں آزادی اور استقلال کے تخیل کو نشو ونما نہ دیں، اس لئے استقلال خود استقلال کی بنیاد کو منہدم کر دیگا، اور ہر ظلم وجور کا انجام یہی ہوتا ہے کہ وہ خود اپنا دشمن بنجاتا ہے،

تمام اخلاقی اوصاف جو انگریزوں کے امتیازی اوصاف ہیں یونیورسٹیوں کی تعلیم و تربیت سے پیدا نہیں ہو سکتے بلکہ طلبہ میں اگر یہ جوہر ہوتے ہیں تو یونیورسٹیاں ان کو ترقی دینے کے بجائے ان کو بالکل فنا کر دینے کے درپے ہو جاتی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے سوا ان اوصاف کے پیدا کرنے کا دوسرا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس ذریعہ کے تلاش کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ وہ ممکن الاستعمال ہے یا نہیں؟ یعنی اس کو ہمارے حالات و خیالات اور اخلاق و عادات کے مخالف نہیں ہونا چاہئے، خوش قسمتی سے ان شرائط کے مطابق ایک ذریعہ موجود ہے، اور وہ فوج اور فوجی خدمت ہے، کیونکہ ہر فرنچ جوان خواہ وہ اسکول کا تعلیم یافتہ ہو یا یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کر چکا ہو فوجی خدمت پر مجبور ہے اور فوج ہی ایک ایسی چیز ہے جو اس چیز کی اصلاح کر سکتی ہے جس کو یونیورسٹیوں نے خراب کر دیا ہے، وہی فرنچ قوم کو جو یونیورسٹیوں کی برکت سے تنزل کے عمیق غار میں گر چکی ہے، بلند پایہ بنا سکتی ہے اسمیں وہ اوصاف پیدا کر سکتی ہے، جس کی موجودہ حالت میں اس کو ضرورت ہے، جنرل "یونال" اور جنرل "ملیتی" نے جو عمدہ نتائج حاصل کئے ہیں ان سے ہم سب واقف ہیں لیکن اس تجربہ کو اور وسیع اور عام کرنا چاہئے، اور جبریہ فوجی خدمت کے قانون کے ساتھ اس قانون کا بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ

"کوئی شخص بھی جب تک وہ فوج میں پانچ سال تک سپاہی کی خدمت انجام نہ دے کوئی سرکاری عہدہ نہیں پا سکتا"

لیکن یہ کوئی معمولی اور آسان کام نہیں ہے، کیونکہ اساتذہ و مفکرین کا گروہ فوجی خدمت کو جوان کے تمام امتیازات کو سلب کر لیتی ہے، نہایت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ فوجی خدمت طالب العلموں کے تین سال کا زمانہ

بالکل ضائع کر دیتی ہے، حالانکہ یہ تین سال ایک طالب العلم کے لئے ان تین سالوں سے زیادہ نفع بخش ہیں جن میں وہ کتابیں پڑھتا ہے، اور غیر مفید چیزوں کو رٹتا ہے، وہ ایک بات اور بھی بھول جاتا ہے، اور وہ یہ کہ مزدور اور کاشت کار بھی اپنے تین سال فوجی خدمت پر قربان کرتے ہیں، لیکن اس قربانی پر ان کو کوئی افسوس نہیں ہوتا، حالانکہ ان دونوں گروہوں کو طلبہ، اساتذہ اور مفکرین سے کچھ کم اہمیت حاصل نہیں ہے،

اخلاقی تعلیم تربیت کے اور تمام اقسام کی طرح اخلاقی تربیت کو بھی صرف تجربہ و عمل پر مبنی ہونا چاہئے، پند و موعظت پر جو اخلاقی کتابوں میں مذکور ہیں، اس کی بنیاد رکھنا صحیح طریقہ تربیت نہیں ہے، اس لئے طلبہ جو اخلاقی حکم و نصائح کتابوں میں پڑھکر ازبر کر لیتے ہیں وہ ایک بے سود چیز ہیں، تجربہ و عمل ہی صرف ایک ایسی چیز ہے جو جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کو یکساں طریقہ سے اخلاقی تربیت دیتا ہے، اس لئے جو لوگ تجربہ کے بجائے پند و موعظت سے کام لیتے ہیں، وہ بچوں کی نفسیت سے بالکل ناآشنا ہیں، اس بنا پر اخلاقی تربیت میں صرف تجربہ و عمل پر بھروسا کرنا چاہئے، اگر تمام دنیا ایک کام کو برا اور دوسرے کو اچھا کہتی ہے، تو بچوں کو بھی اسی اتفاق عام کی بنا پر اُس کام کی بُرائی اور بھلائی کی تعلیم دینی چاہئے،

تجربہ و عمل ہی سے تمام کاموں کے بُرے یا بھلے نتائج معلوم ہو سکتے ہیں، تجربہ و عمل ہی یہ بتاتے ہیں کہ کام کرنا، میانہ روی اختیار کرنا اور وفاداری کرنا عمدہ خصلتیں ہیں کیونکہ ان سے ایک طالب العلم کی اصلاح ہوتی ہے، اور اس کا ضمیر خوش رہتا ہے، ان تجربی و عملی حقائق کے ذہن نشین کر لینے کے بعد معلم کو ان کے نتائج بھی اجمالی طور پر طالب العلم کو بتا دینے چاہئیں، لیکن اخلاقی تربیت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک نیکی اور بدی کے کام بچے کی غیر شعوری عادات و اطوار میں شامل نہ ہو جائیں، یعنی بچے ان کو بغیر علم و ارادہ کے کرنے

کی عادت نہ ڈال لیں، اگر دل میں کسی بُرے کام کی طرف میلان پیدا ہو تو اس میلان کے
دور کرنے کی کوشش ایک نیک کام ضرور ہے، لیکن اس سے زیادہ نیک کام یہ ہے کہ اس میلان
کا احساس ہی نہ پیدا ہونے پائے،

تجربہ و عمل کے ساتھ ضبط نفس کو بھی اخلاقی تربیت کی ایک بنیاد قرار دینا چاہئے کیونکہ
ایک نیک زندگی پر اس ملکہ کا عظیم الشان اثر پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے اس کو
خاص طور پر اہمیت دی ہے، اور وہ تمام کاموں میں اپنے بچوں کو خود اعتمادی کی تعلیم دیتے ہیں،
اخلاقی تربیت پر سب سے زیادہ اثر ماحول کا پڑتا ہے، کیونکہ بچے فطرۃً تقلید پرست
ہوتے ہیں، اور غیر شعوری طور پر اپنے اہل خاندان کی تقلید کرتے ہیں اور یہی غیر شعوری تقلید
اون کی فطرت اور عادت بن جاتی ہے، خود تربیت بڑی مشکلوں سے ان کو پیدا کر سکتی ہی،
اس بنا پر اگر بچے کا ماحول اچھا ہے تو اُس فطرت اور عادت کے پیدا کرنے میں اس کا نتیجہ
اچھا ورنہ برا ہوگا، اور یہ فرانسیسی مثل صادق آئیگی، کہ "پہلے تم مجھ کو اپنے خاندان کا حال
بتا دو پھر میں یہ بتا دوں گا کہ تم کون ہو" لیکن فرنچ ماحول کا اثر تربیت پر نہایت بُرا
پڑتا ہے، کیونکہ فرانسیسی خاندان اپنے بچوں کی کافی نگرانی نہیں کرتے، وہ ان سے سخت محبت
رکھتے ہیں، اور اسی محبت کی وجہ سے ان پر کافی اقتدار نہیں قائم رکھ سکتے جس سے وہ
اُن کی برائیوں کی روک تھام کر کے ان کو نیکی کی طرف مائل کر سکیں، ہر فرانسیسی خاندان
اپنی اس کمزوری کو محسوس کرتا ہے اس لئے وہ اپنے بچوں کو نہایت کمسنی میں مدرسہ میں
تعلیم پانے کے لئے بھیجدیتا ہے، تاکہ اساتذہ کا اقتدار اس کمی کی تلافی کر سکے، لیکن خود
مدرسہ کا ماحول اس سے بھی بُرا ہوتا ہے، وہ بچوں کو نگراں کاروں کے حوالے کر دیتا ہے جنکو
بچے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور یہ نگراں کار بھی ان بچوں کو محبوب نہیں رکھتے، نتیجہ

یہ ہوتا ہے کہ بچے اساتذہ کی تقلید نہیں کرتے بلکہ مکر و فریب اور مداہنت و منافقت سے کام
لیتے ہیں، خود اساتذہ کو بھی یہ فکر نہیں ہوتی کہ وہ بچوں پر اپنا اقتدار قائم کریں، ان کو تو صرف یہ
فکر ہوتی ہے کہ ان کو سبق پڑھا دیں، خواہ وہ اوس سبق سے فائدہ اُٹھائیں یا نہ اُٹھائیں خواہ
علم حاصل کریں خواہ جہالت میں پڑے رہیں، صرف یہی نہیں بلکہ اکثر اوقات اساتذہ کبھی خاموشی
اور کبھی تمسخر کے ذریعہ سے اخلاق کے سخت ترین دشمن بنجاتے ہیں، اور اس کی اہمیت میں شک
کرنے لگتے ہیں، لیکن بچوں بلکہ قوموں کی اخلاقی نشو و نما کے لئے یہ ایک نہایت مضر طریقہ ہی،
کیونکہ مشکوک تعلیم طلبہ کے لئے سخت مہلک چیز ہے، زندہ قوموں کی زندگی شک و شبہہ پر مبنی
نہیں ہوتی، بلکہ یقین و ایمان پر مبنی ہوتی ہے، کسی قوم کا وجود اُس وقت تک نتیجہ خیز اور طاقتور
نہیں ہو سکتا جب تک ایک آئیڈیل کو وہ اپنا مطمحِ نظر نہ بنا لے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ آئیڈیل
وطن کا شرف ہے، کسی پیغمبر کا شرف ہے، یا خدا کی عظمت ہے، ہمکو صرف آئیڈیل سے غرض
ہے، کہ وہ موجود ہو، اور قوموں کے سراپردۂ قلب سے گھرا ہوا ہو، یہ قوموں کے وجود کے لئے
ایک بنیادی شرط ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ وحشت اور جہالت کے عمیق غار سے نکل کر
ترقی اور تمدن کے کنگروں تک پہنچ سکتی ہیں، اگر یہ آئیڈیل خود کمزور ہو جائے، یا اُس کے
ایمان میں ضعف پیدا ہو جائے تو یہ سمجھ لو کہ قوم کا شیرازۂ اتحاد بکھر گیا، اور اس کی قوت کمزور
ہونے لگی، کیونکہ یہی آئیڈیل قوموں کے دلوں کو ایک لڑی میں گوندھ دیتا ہے، اس لئے چند
چیزیں مشترکہ طور پر ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں، جن سے جماعتوں کا وجود ہوتا ہے، لیکن یہ مشترکہ
چیزیں آئیڈیل کے معدوم یا ضعیف ہونے سے فنا ہو جاتی ہیں، اور اس آئیڈیل کی معدوم
یا ضعیف کرنے والی چیز صرف یہ ہے کہ بچوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ اس کا انکار یا کم از کم
اس میں شک کرو، کیتھولک قوموں کی اخلاقی تعلیم میں سب سے بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے کہ

ان قوموں نے زمانہ دراز تک اخلاق کی بنیاد صرف مذہب پر رکھی، اور ان کا اخلاقی اصول محض یہ تھا کہ ایک طاقتور خدا کا وجود ہے جس نے اپنے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے ایک سخت عذاب مقرر کر رکھا ہے، لیکن اب خود مذہب کی بنیاد متزلزل ہوگئی ہے اور اسکے اقتدار میں ضعف آگیا ہے، اسلئے قدرتی طور پر اخلاق کی بنیاد بھی ہل گئی ہے، اگر ان قوموں نے اخلاق کی بنیاد مذہب پر نہ رکھی ہوتی تو اخلاق کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا، اور یہ ایک نہایت آسان سی بات تھی، کیونکہ اخلاق اور مذہب دونوں مختلف چیزیں ہیں، مختلف حالات کے لحاظ سے ہم ایک مذہب کو کبھی قبول کر لیتے ہیں اور کبھی اس کا انکار کر دیتے ہیں، لیکن اخلاق کا سر رشتہ ہم کسی حالت میں نہیں چھوڑ سکتے، اگرچہ سامی قوموں کے نزدیک اخلاق و مذہب میں باہم سخت ارتباط قائم ہے، تاہم دوسری قوموں مثلاً ہندوں کے نزدیک اخلاق ایک مستقل چیز ہے جو مذہب سے بالکل الگ ہے، اس لئے اگر ہم بھی اخلاق کو مذہب سے الگ کرلیں تو اخلاقی تعلیم کا ایک آسان اور نتیجہ خیز طریقہ نکل آئیگا، اور اخلاق و مذہب کی علٰحدگی کا معاملہ نہایت آسان ہے، تھوڑے سے غور و فکر کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے، کہ اخلاق اور مذہب باہم مختلف چیزیں ہیں، کیونکہ دنیا کے مذاہب بدلتے رہتے ہیں، لیکن اخلاق میں کوئی تغیر نہیں ہوتا،

اگرچہ اخلاقی تعلیم میں استاد کو نہایت کوشش اور محنت سے بچوں کو نیکی پر عمل کرنے اور برائی سے بچنے کا خوگر کرنا پڑتا ہے، لیکن اسکے لئے غیر مفید واعظانہ اور حکیمانہ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں اور اگر بالفرض اخلاقی سبق پڑھانے کی ضرورت ہی پیش آجائے تو استاد کو ایک ایسا آسان طریقہ اختیار کرنا چاہئے، جو بچوں کی استعداد سے مناسبت رکھتا ہو، یعنی اسکو چاہئے کہ پہلے جانوروں کے ذریعہ سے اخلاقی سبق دے اور بچوں کو یہ بتائے کہ جانوروں کے گلے اس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک ان میں اخلاق کا وجود نہ ہو، پھر ان کو یہ بتائے کہ انسان جانوروں کو کیونکر ایسے اخلاق و

عادات کی تعلیم دے سکتا ہے جن کے وہ فطرۃً خوگر نہیں ہوتے، پھر تمدنی تاریخ کے ذریعہ سے ان کو یہ تعلیم دے کہ قومیں اپنے نظام اخلاق کو پیدا کرکے کیونکر قعر جہالت سے نکلیں، پھر اس نظام اخلاق کو تباہ کرکے کیونکر اس گڑھے میں دوبارہ گر پڑیں، ان عام چیزوں کے بعد ایسی چیزوں کو بچوں کے سامنے پیش کرے جو ان سے زیادہ خاص ہیں یعنی ان کو یہ بتائے کہ بچہ خاندان کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے خاندان کا محتاج ہے، لیکن خود خاندان جماعت کے ایک جزو ہونے کی بنا پر جماعت کی احتیاج رکھتا ہے، اگرچہ فرد اور جماعت دونوں باہم ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن جس قدر خود جماعت کو فرد کی حاجت ہے اس سے زیادہ فرد جماعت کی احتیاج رکھتا ہے، اس لئے فرد کو اس سے زیادہ جماعت کا احترام کرنا چاہئے جس قدر وہ خود جماعت سے اپنے احترام کا خواستگار ہے[1]،

انگریزوں کی تعلیم و تربیت کا طریقہ، ان کے بیشمار جنگی جہاز، اور ان کی غیر محدود دولت ان کے اقتدار کا سبب نہیں ہے، بلکہ اس کا اصلی سبب وہ آئیڈیل ہے جن کو انھوں نے اپنی زندگی کا قبلۂ مقصود بنا لیا ہے، یہ ایک ایسی قوم ہے جو اپنے اخلاق و عادات کی سخت حریص ہے، اپنے لیڈروں کی سخت عزت و اطاعت کرتی ہے، ان کا وطن ان کا خدا ہے، جس کی وہ بڑی عزت کرتے ہیں، اور اسکو اپنے گھر سے باہر جانے نہیں دیتے، تورات کا خدا انگریزوں

---

(۱) اس میں شبہ ہے کہ یہ طریقۂ تربیت بچوں کی عقلی حالت سے مناسبت رکھتا ہے، یا نہیں؟ بہت کم لوگ انسانی نظام اخلاق کو حیوانی نظام اخلاق سے مستنبط کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یا اس پر اس کو قیاس کر سکتے ہیں، بچہ اتنی عقل کہاں رکھتا ہے کہ وہ تمدنی تاریخ سے اخلاق کا استنباط کر سکے اور ان اجتماعی تعلقات کو سمجھ سکے جن کی تفصیل مصنف نے کی ہے، اگر اس مسئلہ میں خود میری کوئی رائے ہے تو وہ یہ ہے کہ بچوں کو اسباق کے ذریعہ سے اخلاق کی تعلیم نہ دی جائے بلکہ خود ماحول کی ایسی اصلاح کر دیجائے کہ بچوں کے گرد و پیش صرف عمدہ مثالیں چلتی پھرتی نظر آئیں،

کا خدا بن گیا ہے جو صرف انگریزوں ہی کا کام کرتا ہے، اور صرف انہی سے خوش رہتا ہے،
اس خدا نے اپنی قوم یعنی انگریزوں کے لئے چند اخلاقی قوانین بنا دیئے ہیں، جن کا منشا یہ ہے
کہ صرف انگریزی منفعت خیر و شر کا معیار ہے اور انگریز ہی صرف انسان ہیں، ان کے علاوہ
جو قومیں ہیں ان کی حیثیت جانوروں کے گلّے سے زیادہ نہیں،

انگریز جب دور دراز ممالک میں کوئی نوآبادی قائم کرتے ہیں تو اپنے خدا کی دل سے
اطاعت کرتے ہیں، عربوں نے بھی جب وہ "محمد" کا نام لیکر اُٹھے تو ایسا ہی کیا اور اس کی
برکت سے یونانی اور رومانی سلطنتوں کا ایک بڑا حصہ فتح کرلیا، اور ایک ایسی عظیم الشان
سلطنت کی بنیاد ڈال دی جو تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتی ہے، ہم کو انہی دونوں دنیوی
اور دینی مذاہب کے آگے سر جھکا دینا چاہئے، کیونکہ وہی قوموں کی عظمت کے پیدا
کرنے والے ہیں،

خود عقل کو اخلاقی روش اور ایک بلند آئیڈیل کے پیدا کرنے میں کوئی دخل نہیں
ہے، وہ جب کبھی ان سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے، تو یہ چھیڑ چھاڑ صرف تنقیدی حیثیت رکھتی ہے
لیکن جب یہ دونوں چیزیں تنقید کی کسوٹی پر کسی جانے لگیں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اُن کا
دور تنزل شروع ہوگیا، انگریزوں کا نظام اخلاق اور ان کا آئیڈیل کبھی تنقید کی کسوٹی
پر نہیں کسا گیا، وہ نہ اس پر تنقید کرتے ہیں نہ اُس میں شک کرتے ہیں،

اس کے برعکس فرانسیسیوں نے اپنی قدیم بنیاد کو بالکل منہدم کر دیا ہے
اور سیاسی شور و غل میں اپنے بلند آئیڈیل کو بالکل معدوم کرچکی ہیں، پھر اس بلند
آئیڈیل کے بجائے عقلی طور پر اور بھی بہت سے آئیڈیل قائم کئے ہیں لیکن خود عقل ایک
کمزور چیز ہے اور قوموں کے ترکیبی عناصر کے پیدا کرنے میں تو وہ اور بھی کمزور ہے، صرف

ایک آئیڈیل ہم کو زندہ رکھ سکتا ہے، یعنی وطنی تخیل، اسی تخیل کے ارد گرد ہم جمع ہو سکتے ہیں،
اور اسی کے ذریعہ سے ہم متحد ہو سکتے ہیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم اسکو تقویت دیں اور دلوں
پر اس کا اقتدار قائم رکھیں، لیکن انگریزوں کو وطنی تخیل کے قوی کرنے کی ضرورت نہیں،
کیونکہ یہ جذبہ خود ان کے دلوں میں مستحکم طور پر موجود ہے، یہ وطنی تخیل ہی کی برکت ہے
کہ جرمنی میں ایک عظیم الشان طاقت پیدا ہوگئی ہے، لیکن امریکن لوگوں میں یہ تخیل نہایت
کمزور طور پر پایا جاتا ہے کیونکہ یہ ایک نو پیدا قوم ہے، جو باہر سے آنے والوں کی وجہ سے
ہر روز نئی ہوتی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت حریصانہ طریقہ سے اس تخیل کو قوت
اور نشو و نما دیتے رہتے ہیں، لیکن متعلقین یونیورسٹی اس تخیل کے ساتھ حقارت آمیز استہزا کرتے
ہیں، کیونکہ ایک تو یہ کہ ان کو اس کا یقین و ایمان ہی نہیں، دوسرے مختلف فلسفیانہ اور
سیاسی مذاہب نے ان کی عقل کو اپنا بنا کر اُن تمام تخیلات سے بیگانہ کر دیا ہے جو عقل سے
نہیں بلکہ جذبات سے تعلق رکھتے ہیں، اس بنا پر اس تخیل پر تنقیدی بحث و تشکیک کم از
کم وطن کو جنگ، غارت گری اور شورش کا مرکز بنا دے گی، اور یہی وہ مصیبتیں ہیں جن پر مردہ قوموں
کی تاریخ کا خاتمہ ہوا ہے، "ریمون پوانکاریہ" اپنی ایک تقریر میں کہتا ہے کہ

"معلوم ہوتا ہے کہ ایک متعفن ہوا چند دنوں سے بعض فرانسیسی دلوں پر چل گئی
ہے، جو ان تمام یادگار چیزوں کو اڑا لے گئی ہے جن کی نسبت ہمارا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ
باقی رہنے والی ہیں، یونیورسٹیوں تک میں ایسی عقلیں نمودار ہوگئی ہیں، جن کو ایک
ایسے تصوف نے ملیامیٹ کر دیا ہے جو نوع انسانی کی عام محبت سے تعلق رکھتا
ہے، اور ایک ایسی قوم پیدا ہوگئی ہے، جس کا خیال ہے کہ علم کے اندر وطنی اتحاد کا
شعار موجود نہیں، یہ لوگ فوج پر نکتہ چینی کرتے ہیں مجرمانہ الفاظ استعمال کرتے ہیں خدا

کی لعنت اس جھوٹے فلسفہ پر جو وطن پران جرائم کی تہمت لگاتا ہے وہ انسانیت کو جذبۂ
احساس کی تحقیر کرنے کا ایک ذریعہ بناتا ہے، حالانکہ جذبہ واحساس ہی دل کی پاکیزگی کے لئے
نہایت موثر چیز ہیں، اور ان سے اخلاق اور بلند رتبگی کو بڑی تقویت پہنچتی ہے۔"

تحقیر وطنیت کے اس غیر شریفانہ میلان کا سبب نہایت واضح اور نمایاں ہے، اور وہ یہ ہے
کہ مساوات انسانی کا خاتمہ ہو جائے اور ان میں باہم فرق وامتیاز ہو کیونکہ یونیورسٹیوں کے اکثر
پروفیسر قوم کے ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اسلئے جب ڈگریاں حاصل کرکے کچھ اعزاز حاصل کرلیتے ہیں
تو ان کو یہ غرور ہو جاتا ہے کہ وہ عام لوگوں سے ممتاز ہیں، اور اس امتیاز کو قائم رہنا چاہئے، اور وہ
جس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اس سے الگ تھلگ رہنا چاہئے" جارج جولو' نے ایک مضمون میں بھی
سبب بیان کیا ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ جن اہم اسباب کی بنا پر پروفیسر اور ارباب فکر عام
انسانیت کے دوست اور وطن اور فوج کے دشمن ہو گئے ہیں اُن میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ عام فوجی
خدمت کی وجہ سے ان کو مجبوراً چھاؤنیوں میں رہنا پڑتا ہے، اس لئے ان کو مزدوروں اور دیہاتیوں
کے ساتھ معاشرتی تعلقات رکھنے پڑتے ہیں، لیکن یہ مزدور اور دیہاتی ترقی یافتہ عقلی اور فکری
زندگی سے نا آشنائے محض ہوتے ہیں، اسلئے ان جاہلوں کی صحبت ان کو ناگوار ہوتی ہے، اور
چونکہ مجرم کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے جرم کو جائز ثابت کرے اس لئے وہ خود جمہوریت کو جمہوریت
کے ساتھ جنگ کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ فوجی سسٹم کو بیکار ثابت کرکے وہ مزدوروں
اور ادنیٰ طبقوں کے لوگوں کو آزاد کرانا چاہتے ہیں، حالانکہ اُن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے
امتیاز کو قائم رکھیں، اور لوگوں پر حکومت کریں، لیکن اگر ان کے اس خیال کو فاتحانہ کامیابی
نصیب ہو جائے تو بیچارے مزدور اور دیہاتی جن کو یہ ارباب فکر معزز بنانا چاہتے ہیں، اور بھی
ذلیل ہو جائیں، جن قوموں نے وطن کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا ہے، ان کی تاریخ ہمکو بتاتی ہے کہ

وطنیت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، اور قوم کو اس کی کس قدر ضرورت ہے، ہمکو پول اور آرمن قوموں کو دیکھنا چاہئے
کہ اجنبی قومیں ان کو کس قدر مصائب میں مبتلا رکھتی ہیں، ان قوموں نے اپنے وطن کو کھو کر اپنے ہر حق کو کھو دیا
ہے، یہاں تک کہ اُن کی تاریخ بھی گم ہو گئی ہے، لیکن جب تک ہم فوج کا احترام نہ کریں جو وطن کی جانب
سے مدافعت کرتی ہے، ہم وطن کا احترام اور اس کا اعتراف کیونکر کر سکتے ہیں؟ فوجی نظام بلاشبہہ نہایت
تکلیف دہ چیز ہے لیکن با ایں ہمہ وہ نہایت ضروری ہے، اور جب تک دشمن کی طرف سے پورا اطمینان
حاصل نہ ہو اس سے بے نیازی نہیں ہو سکتی، ہم پولیس کے سسٹم کے توڑنے کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے
اسلئے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ سسٹم توڑ دیا گیا تو چوری اور قتل کا دروازہ کھل جائیگا، بعینہ یہی حال فوج
کا بھی ہے، جب تک ہمارے مسلح دشمن ہماری تباہی و بربادی کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، ہم فوج
سے بے نیاز نہیں ہو سکتے،

مشنریوں کے قائم کردہ مدارس

ان تمام تصریحات سے ثابت ہو گیا ہو گا کہ تعلیم کا جو موجودہ نظام قائم
ہے اس کا آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے اور اس کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں لیکن حیرت انگیز طریقے پر وہ
مدارس اس سے مستثنیٰ ہیں، جن کو مشنریوں نے قائم کیا ہے، یہ مدرسے خواہ تجارتی ہوں خواہ صنعتی اور
زرعی حکومت کے قائم کئے ہوئے مدارس سے علانیہ ممتاز ہیں اور خود یونیورسٹیوں نے یہ محسوس
کر لیا ہے کہ وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اسلئے یونیورسٹیوں نے ان کو توڑنا چاہا ہے لیکن اس کامیابی
اور تفوق کا سبب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا، حالانکہ اس کا سبب جو نہایت آسانی کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے
یہ ہے کہ مشنریوں نے تعلیم کا ایک بلند آئیڈیل سامنے رکھا ہے اور وہ ایک حرص آمیز شوق کے ساتھ
اس آئیڈیل کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لئے نہایت اخلاص، نہایت قناعت اور نہایت
استواری سے کام کرتے ہیں، وہی استاد بھی ہیں اور وہی اتالیق اور نگراں کار بھی، اگرچہ یہ بلند آئیڈیل
جس کو انھوں نے سامنے رکھا ہے علمی اور فلسفیانہ حیثیت سے غلط ہے لیکن اسکی قدر وقیمت کا معیار

اسکی صحت یا اُس کی غلطی نہیں ہے، بلکہ وہ عظیم الشان اثر ہے جس کو وہ دلوں پر ڈالتا ہی، لوگ خواہ وہ بد دین ہوں یا مذہبی اس تعلیم کی قدر وقیمت سے واقف ہیں، اسلئے وہ اپنے بچوں کو ان مذہبی مدارس میں بھیجتے ہیں، سلطنت اس تعلیم سے کتنی ہی برسر پیکار ہو، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوسکتی، وہ صرف اتنا کرسکتی ہے کہ ان لوگوں کی وضع کو بدل دے،

فرانس جیسے منقسم شہر میں گرجا کی روح کا پھیلنا خطرناک ضرور ہے، لیکن اس سے مفر کی بھی کوئی صورت نہیں، حکومت نے یہ چاہا کہ جو لوگ حکومت کے سکنڈری مدارس میں داخل نہ ہوں ان کو سرکاری عہدے نہ دے لیکن مشنریوں نے اس پابندی سے اس طرح آزادی حاصل کر لی کہ ان سرکاری مدرسوں میں چند معین گھنٹے کے لئے اپنے طلبہ کو بھیجدیا کہ وہ سرکاری ڈگریاں بھی حاصل کرلیں لیکن اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ حکومت اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی اور ان مدرسوں کو بند کردیا تو دو وجہوں سے اس کا نتیجہ خطرناک ہوگا،

(۱) ایک تو یہ کہ جن طلبہ کے خاندان ان مدرسوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں وہ حکومت سے سخت ناراض ہوجائیں گے، اور اس سے دشمنی کرنے لگیں گے،

(۲) دوسرے یہ کہ ان مدرسوں کے بند کرنے سے اس مفید مقابلہ کا خاتمہ ہوجائے گا، جو یونیورسٹیوں کو آمادۂ عمل کرتا رہتا ہے، اور اس تنزل سے ان کو روک دے گا، جو موجودہ تنزل سے بھی برا ہوگا، میرا خیال ہے کہ میں گرجا کا طرفدار نہیں ہوں، تاہم اگر میں وزیر تعلیم ہوتا تو پرائمری اور سکنڈری تعلیم کا معتمد مشنریوں کو بناتا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ تعلیم میں مذہبی مداخلت نہ کریں تاکہ طلبہ کے خاندان اس حیثیت سے آزاد رہیں،

زندگی کے مصائب کا کسطرح مقابلہ کیا جائے

از

ڈاکٹر میر ولی الدین منشی فاضل ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا، استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اگر غم را چو آتش دود بودے   جہان تاریک بودے جاودانہ!

درین گیتی سراسر گر بہ گردی   خردمندے نیابی شادمانہ! (شہید بلخی)

غم نتیجہ ہے احتیاج کا اور انسان سرتاپا احتیاج ہے، لہذا انسان غم کا پتلا ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی کَبَدٍ" رفع احتیاج ہی کے لئے وہ شب و روز حیران و سرگردان رہتا ہے تمام اسباب و علل کو کام میں لاتا ہی، درد کی دوا چاہتا ہے، ! احتیاج کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے ایک احتیاج کی تشفی ہوتی ہے، تو دس دوسری پیدا ہوجاتی ہیں، اور غم والم برابر جاری رہتا ہے لہذا کلیہ یہ قرار پاتا ہے":-

عالم ہمہ در دست و دوا می خواہد   از خوان کرم برگ و نوا می خواہد!

کس بیحاجت نمی تواند دیدن   درویش غذا شہ اشتہا می خواہد!

(سحابی استرآبادی)

اس کلیہ کا استثنا راشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے، جس کسی سے پوچھئے "میان دل چیست"؟ جواب ملے گا، "درون سینہ سوزے و تفے!" "اگر پوچھا جائے "تن چیست"؟ کہے گا: "غم و رنج و بلا را ہدف"

کسی اور سوال کا انتظار کئے بغیر خود کہہ اُٹھے گا، "القصہ بہ قصدِ جان مابستہ صفے" مرگ از طرفے وزندگی از طرفے۔

دل چیست؟ دردن سینہ سوزے و تفے تن چیست؟ غم و رنج و بلا را ہدفے
القصہ بہ قصدِ جانِ مابستہ صفے مرگ از طرفے و زندگی از طرفے

(مومن یزدی)

مرض غم ہمہ گیر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن یہ کلیہ بھی مسلمہ ہے، کہ ہر مرض کا علاج ہے، غم کا علاج مذہب اور فلسفہ اور نفسیات نے ہمیشہ پیش کیا ہے، کچھ دیر کے لئے آپ میری ساتھ چند نسخون پر غور کیجئے، ایک زمانہ سے مین نے ان کا اپنی ذات کے لئے اور دوسرون کیلئے بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، مین پدرانہ نصیحت کے لئے نہیں کھڑا ہون چند اساسی عقلی اصول کی طرف آپ کی عقلِ روشن کو متوجہ کرون گا، اگر یہ اصول آپکی سمجھ مین آجائین، اور آپ ان کے استعمال پر راضی ہو جائیں، تو شفا یابی متیقن ورنہ تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہون، غم کا حتمی و یقینی علاج مذہب پیش کرتا ہے، اس کی تائید فلسفہ اور نفسیات سے ہوتی ہے، اس علاج کے مختلف اجزا ہین، پہلا جزو

(۱) زندگی کے خیر ہونے کا یقین ہے:- اگر آپ خدا کے وجود کے قائل ہین، (اور اسی صورت مین میرا آپ سے روے خطاب ہے) تو آپ یہ بھی مانتے ہین کہ خدا ہمہ خیر ہے، خیر مطلق ہے خیر محض ہے، نیز وہ ہمہ توان یا قادر مطلق بھی ہے، آپ کا یہ بھی یقین ہے، کہ ہر شے کا صدور خدا سے ہوتا ہے، زندگی کا مبدء خدا ہے، اس لئے زندگی کا خیر ہونا بدیہی طور پر لازم آتا ہے! اگر معاذ اللہ خدا خیر محض نہ ہوتا تو اوس سے شر کا صدور ممکن تھا، یا اگر خیر مطلق ہونے کے باوجود قادر مطلق نہ ہوتا، تو سمجھا جاسکتا کہ وہ خیر کے پیدا کرنے مین مجبور ہے، لیکن خدا کو خیر مطلق و قادر مطلق مان کر زندگی کے شر ہونے کا

یقین کرنا نہ عقل ہی کے مطابق ہے نہ نقل کے، ابتائے مقدمات کے صحیح ماننے کے بعد منطقی نتیجہ سے گریز کیسے ممکن ہے، اور مقدمات کی توثیق مذہب اور وجدان سے ہوتی ہے، لہذا۔

ہر چہ بینی محض خیر و حکمت است گر تر از در رحمت دگر رحمت است
زانکہ ناید فعل باطل از حکیم فعل حق باطل نباشد اے سلیم

یہ دلیل تو مین نے اہلِ عقل کے لئے دی ہے، اہلِ عشق جن کی صفت "یومنون بالغیب" ہے، مبدء کائنات کو خیر محض مانتے ہین، اور اوس کے گرویدہ ہوتے ہین، (اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہ) اور زندگی کے خیر ہونے کا انھین راسخ یقین ہوتا ہے، علاج غم کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اس یقین کو پختہ کرین، کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی، زندگی کے تجربات اچھے، زندگی کے ساتھ تعاون کرنا اچھا، اس تعاون کے نتائج اچھے، انجام اچھا! اسی یقین، اسی الہ مستی و خود گزینی کی وجہ سے آپ بیک جست قنوطیت، یاس، غم و اندوہ کی غلامی سے آزاد ہو جائین گے! اس معاملہ مین "بے یقینی" آپ کو ہمیشہ کے لئے رنج و الم مین گرفتار رکھے گی، اقبال کی تہدید بھول نہ جائے!

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتا غلامی سے بتر ہے بے یقینی!

جب ہم یہ یقین کرین کہ زندگی اور اس کے تجربات اچھے ہین، اور ہمین ان سے خوشی کیساتھ تعاون کرنا چاہئے اور پھر خوشی کیساتھ تعاون کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوجائین تو ہم میں اور زندگی کے واقعات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے اور حالات خود بخود سدھرنے لگتے ہین، شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ایک راز ہے مذہبی زندگی کے تجربات کا جو مین آپ پر فاش کر رہا ہون!

یہ محض ایک اعتقادی بات نہیں ہے بلکہ مسلمہ نفسیاتی اصول پر اسکی بنیاد قائم ہے، خیالات کا اثر افعال پر ہوتا ہے، اور افعال ہی آثار مین تغیر پیدا کرتے ہین، قنوط و یاس خوف و حزن پیدا کرتے ہین اور یہ وہ سلبی جذبات ہین، جو قواے عملی کو مفلوج بناتے ہین، خیالات اور جذبات اگر سلبی ہون تو

سیرت اور قسمت کے سیہ رو ہونے مین باقی کیا رہتا ہے، کیونکہ نفس کا یہ ایک ہمہ گیر قانون ہے کہ خیالات ہی سے مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے، مقاصد عمل مین ظہور پذیر ہوتے ہین، اعمال عادات کا تعین کرتے ہین، عادات کی ترتیب و تنظیم سے سیرت بنتی ہے، اور سیرت ہی تو قسمت ہے! انسان کی زندگی مین وہ دن نہایت ہی مبارک ہوتا ہے جب اوس کو اس امر کی یافت ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا ہے! اس کی ذات ہی مین اس کے آلام کے اسباب پنہان ہین، اور وہین راحت و شادمانی کے علل کا نشان ملتا ہے، ! آفات کے نزول پر خدا کو ظالم اور اپنی ذات کو مظلوم ٹھہرانا نہ صرف الحاد ہے، بلکہ کج فہمی اور بیوقوفی بھی، جب تم خدا کو ہمہ خیر مان کر تمام اچھی صفات سے متصف کرتے ہو تو پھر اسکی طرف ظلم کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے؟ اور خدا ظالم بنکر لائق عبادت کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جو لائقِ عبادت و استعانت نہ ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے، اب اگر خدا پر یقین باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ خدا کو ظالم نہیں عادل مانا جائے اب ظلم کی نسبت ہمیں اپنی ذات کی طرف کرنی پڑے گی، اور اسی کو تمام مصائب و آلام کا مبدأ قرار دینا پڑیگا، مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ!

ان حقائق کے سمجھ لینے کے بعد تم جرأت کے ساتھ یقین کر لو کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی اور اسکے واقعات و تجربات اچھے، نقص کجی یا شر کہین ہے، تو تمھاری ہی ذات مین ہے، مصائب کے نزول کے وقت قضا و قدر پر اعتراض نہ کرو، بلکہ توافق بالقضا سے کام لو، اس احساس کو قلب مین نہ آنے دو، کہ تم پر ظلم ہوا، یا تم، اور تم قابلِ رحم ہو، کیونکہ اس احساس کے ساتھ ہی تم خدا کو ظلم سے متصف کرنے لگوگے، اور اپنے کو بے خطا و بے قصور قرار دوگے، اور تم نے دیکھا ہے کہ واقعہ ہمیشہ اس کے خلاف ہوتا ہے! اپنی ذات کو بے خطا و بے قصور سمجھنا جب کہ وہی تمام سو کا مبدأ ہو، کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے! ایسی صورت مین کیا اصلاحِ نفس کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے، ؟ کیا ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند

نہین ہو جاتا؟ جو شخص اپنی ہی جان پر ترس کھا رہا ہو، اپنی ہی قسمت پر آنسو بہا رہا ہو، اپنی ہی تقدیر کی شکایت میں ہمیشہ مصروف رہتا ہو، اور ساری دنیا کو اپنا مخالف سمجھتا ہو، میرے نزدیک اس قابل ہے، کہ کوہ ہمالیہ کی چوٹی سے نیچے گرا دیا جائے تاکہ اس کو بھی نجات ملے، اور دنیا بھی خس و خاشاک سے پاک ہو جائے، ! اقبال ایسے ہی بدبخت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے، :-

اے ز جور چرخِ ناہنجار تنگ | جام تو فریادی بیدادِ سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا | سینہ کوبیہاے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات | لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو | شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن | ہست در میدان سپر انداختن
مرد خود دار کہ باشد پختہ کار | گر نسازد با مزاجِ او جہان
می شود جنگ آزما با آسمان | بر کند بنیادِ موجودات را
می دہد ترکیبِ نو ذرات را | می کند از قوتِ خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد سازگار | در جہان نتوان گر مردانہ زیست
ہمچو مردان جان سپردن زندگیست

یقین کی اساس قائم ہونے کے باوجود عمل کی مشید عمارت اٹھائی جانی چاہئے، اب تک ہم نے اس امر پر زور دیا، کہ یقین درست کرنا چاہئے یقین کی زندگی اچھی چیز ہے، اور زندگی کے واقعات و تجربات اچھے ہین، ان کے ساتھ تعاون ضروری ہے، یہ علاج غم کے نسخہ کا پہلا جزو تھا، اس کا دوسرا جزو عمل ہے، جسکو زندگی کے ساتھ تعاون کہا جا سکتا ہے،

۲- عمل، مبدأ غم احتیاج، احتیاج کا دفعیہ عمل ہی سے ممکن ہے لیکن یہ ضروری نہین کہ عمل ہمیشہ کامیاب ہی ہو، اور ساری احتیاجات کو رفع کر سکے، عمل کو کامیاب بنانے اور ناکامی کی

صورت مین غم واندوہ سے متاثر نہ ہونے کا بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہی؟ بات بڑی آسان ہوتی، اگر انسان کی ساری احتیاجات عمل سے رفع ہو جاتین، اور وہ محض چین وراحت کی زندگی بسر کرسکتا، عمل کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہین، کامیابی یا ناکامیابی، عام طور پر فطرت کا یہی اصول ہے کہ مجاہد کے آگے دنیا اپنا سر جھکاتی ہے، مجاہد خطرہ ہی کی زندگی کو حقیقی معنی مین زندگی سمجھتا ہے، ع

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

ناکامی سے یہ مایوس ہوکر نالہ وفریاد، سینہ کوبی اور ماتم نہین کرتا، کیون؟ اسکے چند تیقنات وعقائد ہین، ان ہی کی تحلیل سے علاجِ غم کے دوسرے جزو کی تشریح ہو جائے گی،

مجاہد زندگی کو جہاد اکبر سمجھتا ہے، دشمنون سے جنگ اور میدانِ کارزار کا جدال وقتال اس کے نزدیک "جہاد اصغر" ہے، اس کا بنیادی یقین یہ ہوتا ہی کہ حق بالآخر کامیاب ہوگا، اور باطل کو شکست ہو گی، چونکہ وہ ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلاء کے لئے جہاد کرتا ہی اسلئے اسکو یقین ہے کہ خدا سے نصرت وتائید کا پانا اس کا حق ہے، وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ اس وعدہ اور یقین کی وجہ سے "احساسِ کمتری" یکلخت اس سے مفقود ہو جاتا ہے، اب وہ کامیابی کے یقین کی ناقابل مدافعت قوت کیساتھ عمل کرتا ہی، اس کا ایمان ہوتا ہی، کہ تمام حول وقوت من اللہ ہے، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، وہ صرف اللہ ہی کو فاعل اور موثر حقیقی سمجھتا ہے، اور خود کو امین وخلیفہ، قوت واثر وحرکت مین وہ اللہ ہی سے استعانت کرتا ہے، اور اسی کے سامنے سرِ عبودیت خم کرتا ہی ذل وافتقار کی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عبادت واستعانت مین وہ اپنی نسبت صرف اللہ ہی سے رکھتا ہے، اور فانی عن الخلق ہوتا ہے، یعنی نہ مخلوق سے استعانت طلب کرتا ہے، اور نہ ان کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہے، وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا اس کا ماٹو ہے، فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا اسکا اصول عمل قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ اس کا طریقہ کار، حَسْبِيَ اللّٰهُ اس کا راحت جان کلمہ، ایک لفظ مین

وہ موحد ہوتا ہی، اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا قائل ومصدق وعامل!

اس یقین وعقیدہ کی تحریک سے اس کا ہر عمل پیدا ہوتا ہے، اب جیسا کہ ہم نے اوپر کہا عمل کے دو ہی نتائج ہوتے ہین، کامیابی یا ناکامیابی، کامیابی مین وہ شکر کرتا ہے، کیونکہ وہ اس راز سے واقف ہی (جو ایک مسلمہ نفسیاتی اصول پر مبنی ہے) کہ شکر سے نعمت مین اضافہ ہوتا ہے، قوت عمل مین جوش پیدا ہوتا ہی اور تسخیرِ کائنات آسان ہو جاتی ہے، لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ کا قطعی وعدہ اس کو مسرور کرتا ہے، وہ اس کامیابی اور نعمت کو خدا کی جانب سے سمجھتا ہے، اور خلق کی طرف اسکی نسبت نہین کرتا، گو خلق ہی کے ہاتھ ہی سے نعمت ملتی ہے لیکن یہ محض بمنزلہ اسباب وآلات وادواتِ نعمت ہوتے ہین، قاسم ومجری وموجد وفاعل ومسبب صرف اللہ ہی ہوتا ہے، اس لئے وہی شکر کا مستحق ہے، مثلاً جب تمھین تمھارا کوئی دوست ہدیہ بھیجتا ہے، تو تمھاری نظر اس خادم کی طرف نہین جاتی، جو یہ ہدیہ تمھارے یہان لیکر آیا ہے، بلکہ اپنے دوست کے تم شکر گذار ہوتے ہو جس نے تمھیں یہ بھیجا ہے، منعم حقیقی اللہ ہے، "اَلْعَاطِي اللّٰهُ" - "وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" اس ادراک سے نعمت زوال کے خطرہ سے آزاد ہو جاتی ہے، یہ ایک عظیم الشان حکمت ہی جسکو بصیرت محمدیہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہی، اس راز کو ان الفاظ مین ادا کیا گیا ہے،!

اَلنِّعْمَةُ وَحْشِيٌّ فَقَيِّدُوْهَا بِالشُّكْرِ   نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیرون سے اوس کو باندھو!

یہ تفسیر ہو باری تعالیٰ کے اس قول کی کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ،

موحد جب اپنی جدّ وجہد مین ناکام ہوتا ہے، تو یاس وحزن خوف والم کا شکار نہین ہو جاتا، کیون؟ اسلئے کہ وہ کائنات کے ایک قدیم راز سے واقف ہوتا ہے، جو دفع غم کے لئے اکسیر ہے اور جس کو "بصیرتِ محمدیہ" نے دریافت کیا ہی، وہ کیا ہے؟ یہی کہ بلاؤن پر صبر کرنے سے بلائین نعمتون

ہیں مبدل ہوجاتی ہیں"۔ ذرا نفسیاتی نقطہ نظر سے اس قانون پر غور کرو مصائب کے نزول کے وقت صبر سے بہتر کوئی اور پہلو ہیں اختیار بھی کرسکتا ہے، ؟ حزن و یاس سے قوائے عمل مفلوج ہوجاتے ہیں، مصیبت کے مقابلہ اور برداشت کی قوت فنا ہوجاتی ہے، تردد و فکر بھی عمل کے قاتل ہیں، تشتت اور پریشانی کو بڑھاتے ہیں، گلہ و شکوہ تو نامردی کی صریح علامت ہے، کلبیت "استہزاء" استخفاف غم کی دوا نہیں، بلاؤں کے نزول کے وقت جب انسان حق تعالیٰ کی گذشتہ عطاؤں کو یاد کرکے صبر کرلیتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کے قلب کی حفاظت کرلیتے ہیں مستغنی کردیتے ہیں، اب بار غم سبک ہوجاتا ہے، برداشت کی قوت بڑھ جاتی ہے، اور وہ انہی بلاؤں میں عطاؤں کو پاتا ہے،

خود بلا و ابتلا کی ماہیت کے متعلق مجاہد صحیح علم رکھتا ہے، ہر بلا ایک اخلاقی سبق دینے آتی ہے، یہ ہمارے کسی کسی نقص کو رفع کرتی ہے، اور اخلاقی اعصاب کو قوی کرتی ہے، سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہے، اس طرح ہمارے مراتب بلند کرتی ہے، اور درجات میں ترقی دیتی ہے، یہ بظاہر شر ہے، لیکن دراصل خیر کے تحقق کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے، زندگی ایک مدرسہ ہے، واقعات زندگی کے ذریعہ معلم حقیقی ہمیں ہر روز سبق دیرہا ہے، اگر ہم میں عقل ہو تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ہماری ہر ناکامی میں بھی ایک حکمت ہے، اور اور ایک خاص عظمت، سوائے اس ناکامی کے تجربہ کے دنیا کی کوئی اور شئے ہمیں نہ یہ درس حکمت دیسکتی ہے اور نہ عظمت کے اس درجہ پر فائز کرسکتی ہے، ہر غلطی جو تم سے سرزد ہوتی ہے، ایک اہم سبق سکھاتی ہے، اگر تم اسکی تحقیق کرو، اور جو شخص کہ اس شئے میں جو بظاہر شر معلوم ہوتی ہو خیر کو دریافت کرنیکی کوشش کرتا ہے، وہ واقعات کا محکوم نہیں حاکم ہے، ناکامی اس کے لئے ایک صبا رفتار مرکب ہے، جو اس کو بہترین کامیابی تک پہنچاتا ہے،

بلا کی شدت اگر تمہیں بالکل ہی مغلوب کرلے، اور اس کے خیر اور فائدہ کے جز سے مستفید ہونے کے قابل نہ رکھے، تو پھر تمہیں صبر ہی کے دامن میں سکون ملے گا، اور صرف مذہب ہی تمہاری دلجوئی

کریگا، ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو مومن صابر کے حق میں وارد ہوئی ہیں، اگر تم میں ایمان اور ایمان کا ذوق کا بھی موجود ہے، تو یقیناً تمہارا غم ہلکا ہوجائیگا، صابر خدا کا محبوب ہوتا ہے، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ، اور وہ صابر خدا کی معیت کا ادراک کرتا ہے، کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ اس امر کا یقین کہ خدا میرے درد و غم سے واقف ہے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی ہے، غم کی چبھن کو کم کردیتا ہے، اور وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا کا حکم اور بشارت تو اس کو رقص میں لانے کیلئے کافی ہو، مشہور ہے کہ کسی عاشق پر سر بازار ۹۹ تازیانے لگائے گئے اور اس نے آہ تک نہ کی جب سواں تازیانہ لگا، تو اوس نے آہ کرنی شروع کی، پوچھا گیا کہ اس آخری تازیانہ پر آہ و بکا کیسی؟ کہا جس کے سبب مار کھائی ہے، وہ ۹۹ تازیانوں تک یہاں تماشائیوں میں موجود تھا، اور میری حالت دیکھ رہا تھا، اس لئے مجھے کچھ بھی درد محسوس نہ ہوا، آخری تازیانے کے وقت وہ چلا گیا، اور اسوقت میں نے درد محسوس کیا، ؎

بادرد بساز چون دوائے تو منم ۔۔۔ در کس منگر کہ آشنائے تو منم،

گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی ۔۔۔ شکرانہ بدہ کہ خونبہائے تو منم، (جامی)

صبر پر استقامت پیدا ہوجائے، تو تسلیم و رضا کا آخری مرتبہ حاصل ہوجاتا ہے، اب مجاہد صاف طور پر یہ محسوس کرنے لگتا ہے، کہ بلا از دوست عطاست و از عطا نالیدن خطاست، اَلْبَلاءُ کَنْزٌ مِنْ کُنُوْزِ الْجَنَّۃِ لَا یُعْطِی الَّا الْاَوْلِیَاءَ ہ کی وہ تصدیق کرنے لگتا ہے، اب نہ شکوہ شکایت ہی کا امکان باقی رہتا ہے، اور نہ جزع و فزع کا، ؎

ستم کشان محبت دم از فغان بستند

گرہ زجبہ کشادند بر زبان بستند

سچ ہے درد و غم کا قطعی علاج تسلیم و تفویض ہے، اسکے سوا کچھ نہیں، ؎

تسلیم نمی شوی ازان غمگینی   تسلیم شو ہر آنچہ آید بینیت

رضا بالعطا اور رضا بالقضا سے نہ صرف غم ہی دور ہوجاتا ہے، اور فرح و سرور کے دروازے کھل جاتے ہین، بلکہ حق تعالیٰ بھی قطعی راضی ہوجاتے ہین، اور جانتے ہو، کہ اون کی رضامندی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے،؟

آنانکہ رضاے حق بجان می جویند   در راہ رضاے او بسر می پویند!
ہر یک ہمہ آن کنند کہ حق فرماید   حق نیز ہمان کند کہ ایشان گویند!

قال علیہ السلام: اِنَّ للّٰہِ رِجالاً یَرضٰی بِرِضائِھِم وَیَغضَبُ بِغَضَبِھِم کَاَنَّھُم یَرضَوا بِرِضائِہٖ وَیَغضَبُوا بِغَضَبِہٖ ۔

ہرچہ خواہی آن کند گر ہرچہ خواہد آن کنی   آنچہ گوئی بشنود گر ہرچہ گفت او بشنوی!

اے درد! تو بھی کیا نعمت ہے، تری برداشت نے مجھے کیا سے کیا کر دیا!

در دہ قدحِ درد کہ آن می باید   در دیگہ زتست بیشتر می باید
تلخست عجب لیک بسی خوش خوار است   ہرچند ہمی خورم دگر می باید

بہجۃ العالم

از

مولانا سید ابوظفر ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورنیکلر سوسائٹی، احمد آباد

ان دنوں ایک علمی کتاب ملی ہے اس کا نام "بہجۃ العالم" ہے، یہ جغرافیہ میں ہے مصنف کا نام معلوم نہیں زبان فارسی ہے، ابتدائی چند صفحات مقدمہ کے نہیں ہیں، لیکن اصل کتاب شروع سے ہے، لکھتا ہے، کہ اُس کا نام بہجۃ العالم رکھا، اور اس کے بعد خریدۃ العجائب تحفۃ الالباب اور رسالہ احوال بہنسا کا (جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی جگہ ہے) عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا اور اس مجموعہ کا نام "روضۃ الافراح" رکھا، مگر افسوس ہے کہ ہمارا یہ دوسرا حصہ نہیں ہے، صرف اوّل حصہ بہجۃ العالم ہے، اس کی ابتدا اقلیم اوّل سے ہے، مختصر حالات دیئے ہیں، کل صفحات ۱۴۱ ہیں، تقطیع کلاں، خط نستعلیق، کتابت کے اغلاط بہت ہیں، آخر میں ایک ورق "تحقیق المساحۃ" میں ہے، دہلی کے حال میں لکھتا ہے کہ "اگرچہ سڑکیں بڑی چوڑی ہیں، مگر ایران کی طرح آب پاشی کا یہاں دستور نہیں، اس لئے راہ رو گرد و غبار میں اٹ جاتا ہے، اور برسات میں کیچڑ سے لت پت ہوجاتا ہے، پھر لکھتا ہے کہ شاہ عالم اور اس کی اولاد کی قبریں اسی جگہ ہیں"، ان دونوں فقروں سے معلوم ہوا کہ مصنف شاہ عالم کے بعد دہلی آیا ہے اور غالباً یہ زمانہ محمد شاہ کا ہے، اس حساب سے اس کتاب کا سنہ تصنیف بارہویں صدی

کا وسط ہے،

لاہور کے متعلق لکھتا ہے کہ محمود کے غلام ایاز نے شہر سے باہر ایک نوآبادی بسائی تھی جس میں تین تین چار چار منزلہ مکانات تھے، اسی میں ایک قلعہ بھی تعمیر کیا تھا، اور ایک نہر بھی راوی سے لاکر اس کے گرد گھمائی تھی، ص۲۰ میں ہے کہ غزنہ میں ۱۲ ہزار مسجد اور مدرسے تھے، ص۳۰ میں ہے کہ "مجمعات جہانگیری" میں یہ بات لکھی ہے، کیا مجمعات جہانگیری آنجناب کی نظر سے گذری ہے؟ یا اس کے متعلق کچھ علم ہے؟ ص۳۱ میں ہے کہ لکھنؤ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں کی ہوا اچھی ہے، کمان خوب بنتی ہے، قند وہاں کا مشہور ہے، سفید اور گلابی رنگ کا سات آٹھ سیر کا ایک کلہ ہوتا ہے، عام قند سے بہت بہتر ہوتا ہے، اور باہر بہت جاتا ہے، ص۱۲۵ میں ہے کہ ماوراء النہر کے شہر ساس (شاید سوس ہو) میں پتھر کے کوئلے کی کان ہے، لوگ اس کو جلاتے ہیں، اور اس کی راکھ سے کپڑے دھوتے ہیں جبل کرمان میں بھی پتھر کے کوئلہ کی کان ہے، ص۱۳۱ دامغان میں ایک چشمہ ہے کہ اس میں نجاست ڈالنے سے بڑے زور کی ہوا اٹھتی ہے، اور جب تک نہ نکالیں ہوا کی تیزی کم نہیں ہوتی، بامیان میں بھی ایک چشمہ ہے کہ نجاست ڈالنے سے اس میں اسقدر طغیانی آتی ہے کہ خوفناک ہو جاتی ہے،

عرب کی موجودہ حکومتیں

تلخیص وتبصرہ

مڈگاسکر میں اسلام

حال میں ایک مشنری نے مڈگاسکر میں تبلیغ عیسائیت کے سلسلہ میں ایک مضمون لکھا ہے، اس میں یہاں کے اسلامی اثرات اور مسلمانوں کے متعلق بھی مفید معلومات ہیں، اس لئے اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے،

جزیرہ مڈگاسکر افریقہ سے ۲۴۰ میل مشرق میں ہے، اس کا طول تقریباً نو سو اسی میل اور عرض تین سو پچاس میل ہے، مڈگاسکر اور جزیرہ کمورا دونوں فرانسیسی نوآبادیات ہیں، اس کی آبادی میں عرب عنصر نویں صدی عیسوی سے شامل ہے، مڈگاسکر میں عیسائیت کی ترقی واشاعت کی تازہ ترین اطلاع یعنی پانچویں انٹر مشنری کانفرنس ۳۹ء منعقدہ مڈگاسکر کی رپورٹ میں درج ہے، کہ اس جزیرہ میں چھ لاکھ بیس ہزار پروٹسٹنٹ اور تین لاکھ دسہزار رومن کیتھولک اور اٹھائیس لاکھ غیر عیسائی آباد ہیں، مسلمانوں کی آبادی پروٹسٹنٹ عیسائیوں سے زیادہ ہے، لیکن عیسائی مبلغین کی توجہ ابھی ان حلقوں اور قبیلوں کی طرف نہیں ہوئی ہے جنہیں مسلمانوں کی اکثریت ہے،

۲۲ء میں ایک مشہور فرانسیسی عیسائی مبلغ نے بیان کیا تھا، کہ مڈگاسکر کے علاقوں میں تبلیغ عیسائیت کا کوئی کام اب تک نہیں ہوا ہے، یہاں مسلمانوں کی مسجدیں اور مدرسے ہیں، وہ نہایت احتیاط کیساتھ

اپنی زبان کی حفاظت کرتے ہیں، اور عیسائیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے،

یہاں کی آبادی میں عرب عنصر نویں صدی عیسوی سے شامل ہوا ہی اس جزیرہ میں دونوں کے نام عربی ہیں، جنوبی مغربی اور شمالی مشرقی حصوں میں عربی النسل طبقے حکمراں ہیں،

ابتدا میں اس جزیرہ کے باشندوں پر بھی جن کو ملاگاسی کہتے ہیں، عربوں کا اثر تھا، اس کا پتہ ملاگاسی زبان کے ان الفاظ سے چلتا ہے جو عربی سے لئے گئے ہیں مثلاً ہفتوں اور مہینوں کے نام نجوم اور علم غیب، لباس، بستر، سکوں کتابوں، تحریروں، موسیقی کے آلات، سلام وغیرہ اور بہت سی چیزوں کے نام و اصطلاحات عربی ہیں،

مڈگاسکر کے مسلمان تین حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں، جنوب میں جزیرۂ کمورا (آبادی ۱۹۶۰۵۰) ننگارا (۱۰۵۷۸) اور سمہیتی (۷۸۹۱۳) کے باشندے، جنوب اور مغرب میں سکاوالا (۲۰۹۰۰۰) انتہائی جنوبی حصہ ٹیمارو (۵۲۰۰۰)، تموہوکار (۲۴۰۰۰) تفاسی (۳۶۰۰۰) اور تیکاساد (۱۳۱۰۰۰) ان سب کی مسلم آبادی ۷۰۰۰۰ ہے ۱۹۳۶ء میں یہ آبادی ۴۰۰۰۰ تھی، ۱۹۳۸ء میں ۸۰۵۰۰۰ ہوگئی ہے،

عرب چھٹی اور نویں صدی میں یہاں آئے اور کچھ لوگوں کو حلقۂ اسلام میں داخل کیا، یہ لوگ غالباً خلیج فارس سے آئے تھے اور سنی تھے، ایک دوسری جماعت دسویں صدی میں کابرا سے آئی، کچھ ایرانی بھی دسویں صدی میں آئے تھے، آخری بار عرب تیرہویں صدی کے وسط میں اس جزیرہ میں داخل ہوئے،

یہاں کے باشندوں پر عربوں، ان کی زبان اور معاشرت کا بہت اثر ہے، مڈگاسکر اسکی بڑی مثال ہے، کہ اسلام جہاں خود قوی نہ ہوسکا، وہاں کم از کم اسلامی خیالات اس نے پھیلا دیئے مڈگاسکر کی زبان پر اسلام کے بے شمار نقوش ہیں، سب سے اہم عربی حروف تہجی ہیں جواب بھی جنوب مشرق میں اور کسی زمانہ میں اس سے بڑے رقبہ میں رائج تھے، تھوڑا زمانہ ہوا مسلمان ایک عربی رسالہ قمر الدین شائع کرتے تھے، جزیرہ کمورا میں بھی تقریباً عربی ہی حروف تہجی رائج ہیں،

مڈگاسکر کے غیر اہل کتاب طبقوں میں بھی عربوں کا نمایاں اثر ہے، سارے جزیرہ میں ختنہ کی رسم تقریباً عام ہے جو اسلام کے اثر کا نمایاں ثبوت ہے، یہاں ایک بڑا سالانہ تہوار منایا جاتا ہے، جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ عید الفطر کی ایک شکل ہے، یہاں کی لامذہب جماعتوں میں جو توہمات پائے جاتے ہیں، اون میں بہت زیادہ اسلامی اثر کا پتہ چلتا ہے، یہاں کے تمام قبیلے تقدیر کے قائل ہیں، جو غالباً عربوں ہی کا اثر ہے، مڈگاسکر کے جنوب مشرق میں بسنے والا قبیلہ برائے نام مسلمان ہے لیکن اس میں بھی اسلامی شعائر اور روایات پائے جاتے ہیں، یہ نقشہ دور ماضی کے اسلام کا تھا، جب نہ پروٹسٹنٹ عیسائی وہاں پہنچے تھے اور نہ فرانسیسی اقتدار قائم ہوا تھا،

یہاں کے موجودہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ جزیرہ کمورا کے مسلمان شافعی مذہب کے پیرو ہیں، ان کی زبان سواہیلی ہے، نام کے تین سلطان فرانسیسی اقتدار کے ماتحت ہیں، مغربی ساحل ساکالاوا کے مسلمان اسلامی شعائر کے کچھ بہت زیادہ پابند نہیں ہیں، جنوب و مشرق کے مسلمان ابتداءً مکہ معظمہ سے آئے تھے،

۱۹۲۴ء سے ہندوستانی احمدی جماعت کے آدمی یہاں ماریشس اور زنجبار سے آنے لگے ہیں، انکو تبلیغ اسلام میں کسی حد تک کامیابی ہوئی ہے، ۱۹۱۳ء میں تبلیغ عیسائیت کے مشن نے یہ رپورٹ کی تھی کہ عرصہ سے جزیرہ کے مشرقی حصہ میں عربوں کا اثر محسوس کیا جارہا ہے، بہت سے ہندوستانی مسلمان یہاں آکر بس گئے ہیں، اور جزیرہ کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے مسلمانوں سے جن میں تعدد ازدواج کی رسم ہے، اس اثر کو زیادہ تقویت پہونچی ہے، اگر گذشتہ تبلیغ تجربوں سے سبق لیا جاسکتا ہے، تو یہ بات بالکل عیاں ہے کہ قبول اسلام کے بعد قبول عیسائیت کا مسئلہ بہت دشوار ہوجاتا ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان رقبوں کو بہ جبر عیسائی اثر و اقتدار میں لایا جائے،

۱۹۱۹ء میں رابرٹ گریفتھ نے بیان کیا تھا کہ شمالی مغربی ڈگاسکر میں اسلام بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے، عرب اور زنجبار کے مسلمان مبلغین گاؤں گاؤں میں اور ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک تبلیغِ اسلام میں مصروف ہیں، اس بات کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام عیسائیت کی ترقی کا زینہ نہیں، بلکہ عیسائیت کا سب سے بڑا اور سخت ترین مدمقابل ہے، اخلاقی لغزشوں کے باوجود مذہب کے ظواہر ہی کا بڑا اثر محسوس کیا جا رہا ہے، چنانچہ ڈگاسکر کے مغربی ساحل پر نومسلموں کی تعداد اسّی ہزار ہو چکی ہے، ایک فرانسیسی مشنری کا بیان ہے کہ گجراتی مسلمان بھی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم ہیں، اور اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں وہ حبشی اور سفید آبادی کے درمیان رابطہ قائم کرتے ہیں، یہاں کا اسلام سطحی سہی، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے وہ خطرناک نہیں ہے، یہی نام نہاد تبدیلِ مذہب، اسلام کی اشاعت کے لئے بڑی سہولتیں پیدا کرتا ہے، یہاں اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کا مرکز مجینگا ہے، ان لوگوں تک پہنچنے کے لئے آج تک کچھ نہیں کیا گیا،

"ن ص"

تاریخ اسلام

(از آغاز اسلام تا حضرت حسنؓ)

مرتبہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی

اس کتاب میں عرب قبل از اسلام کے حالات اور ظہور اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی اسلام کی مذہبی سیاسی اور تمدنی تاریخ ہے، حجم ۳۰۸ صفحے، قیمت ۱-۸-ر

"منیجر"

اخبار علمیہ

چائے سے عربوں کی قدیم واقفیت

ڈاکٹر ماکس ماہرہوف نے حال میں مجمع علمی قاہرہ میں ایک لکچر دیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے چینی چائے سے واقفیت حاصل کی اور اس کو استعمال کیا وہ عرب تھے، وہ نوسو برس سے چائے سے واقفیت رکھتے ہیں، اس کے حسب ذیل ثبوت انھوں نے دیئے ہیں، سب سے پہلے چینی چائے کے اوصاف مشہور مسلمان سیاحِ چین سلیمان نے اپنے سفرنامے میں بیان کئے ہیں، جس نے ۲۳۶ھ مطابق ۸۵۱ء میں چین کا سفر کیا تھا، اس کے بعد عباسی عہد کے مشہور طبیب حنین بن اسحاق المتوفی ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء نے چینی چائے اور اس کے خواص پر مقالہ لکھا، اس کے بعد مشہور عالم ریاضی ابوریحان بیرونی المتوفی ۴۴۲ھ مطابق ۱۰۵۰ء نے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا، اس مقالہ میں ہے کہ ایک مرتبہ خاقان چین کا ایک امیر سخت قسم کے یرقان میں مبتلا ہو گیا، اتفاقی طور پر اس کو چائے کے جوشاندہ سے فائدہ ہو گیا، اس وقت تک چین میں بھی اس کا استعمال نہ تھا، اس کے فائدہ کو دیکھ کر بادشاہ چین نے اس کے استعمال کا عام حکم دیا، اس وقت سے چین میں اس کا عام رواج ہوا، ملا طاہر نے ایک رسالہ میں جس کا قلمی نسخہ کتب خانۂ تیموریہ مصر میں محفوظ ہے چینی سیاحوں کے بیان سے چائے کے متعلق بہت سے قصے نقل کئے ہیں، جن میں وسط ایشیا میں چائے کے طریقۂ استعمال کی تفصیلات ہیں

روڈس میں مسلمان

جزیرہ روڈس مسلمانوں کا بہت قدیم مقبوضہ تھا، حضرت امیر معاویہ کے زمانہ میں فتح ہوا تھا، اس لئے یہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی، لیکن جب سے وہ ترکوں کے ہاتھ سے نکلا، مسلمانوں کی آبادی بہت گھٹ گئی ہے اور بحر ایض کے دوسرے اسلامی جزائر کریٹ اور سسلی کی طرح یہاں سے بھی مسلمان ہجرت کر گئے اور اب کل پانچ ہزار رہ گئے ہیں، یعنی کل آبادی کا دس فیصدی ترکوں کا قبضہ اُٹھنے کے بعد موجودہ حکومت نے مسلمانوں کے شرعی نظام قضا کو توڑ دیا ہے، اور ان کے تمام اوقاف اپنی نگرانی میں لے لئے ہیں، صرف مسلمانوں کا ایک مفتی باقی رہ گیا ہے جسے حکومتِ اوقاف سے تین گنی ماہوار دیتی تھی اور بیس گنی ماہانہ حکومتِ مصر سے ملتی تھیں، لیکن اب کچھ دنوں سے مصر نے گھٹا کر دس کر دیا ہے،

ہوائی ارتفاع پیما

اب تک فضا کا ارتفاع پیما پیمائش ہوا کے اصولوں پر استعمال کیا جاتا تھا اس سے صرف ان بلندیوں کو دریافت کیا جا سکتا تھا جو سطح سمندر سے اوپر ہوں سطحِ سمندر سے نیچے کے ارتفاع کی پیمائش کی کوئی صورت نہ تھی لیکن اب ریڈیو کے اصولوں سے اس میں بڑی مدد مل رہی ہے، اور ریل ٹیلیفون کے عمل نے برقی ہوائی ارتفاع پیما کو اس طرح ترقی دی ہے کہ اس سے پانچ ہزار سے لیکر پچاس ہزار فٹ تک کی بلندی کو آسانی کے ساتھ ناپا جا سکتا ہے، ہوا کے دباؤ اور موسم کے تغیرات وغیرہ کا اس آلہ کے عمل پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کو ہوائی جہاز کے کسی حصہ میں آسانی کیساتھ لگایا جا سکتا ہے، اس سے سطحِ زمین کے ناہموار ارتفاع کو ناپا جا سکتا ہے، لیکن بہت زیادہ ناہموار زمین اور عمارتوں میں کام نہیں دیتا،

"م"

ادبیات

تابشِ سہیل

از

مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل،

نظر صہبا نہ بنجائے کہ دل مینا نہ ہو جائے ۔۔۔ تم آجاؤ تو جوشِ سرخوشی میں کیا نہ ہو جائے

حریمِ حسن سے بیگانگی پیدا نہ ہو جائے ۔۔۔ کہیں خودداریِ غم بڑھ کے استغنا نہ ہو جائے

دلِ محزوں میں حشرِ آرزو برپا نہ ہو جائے ۔۔۔ تری پرسش کہیں اور اضطراب افزا نہ ہو جائے

اُدھر سے آپ عرضِ شوق کا ایما نہ ہو جائے ۔۔۔ کہیں باطل دلِ خوددار کا دعوی نہ ہو جائے

بھلا وے دل انھیں بھی محوِ شوق اتنا نہ ہو جائے ۔۔۔ محبت خود محبت کے لئے پردا نہ ہو جائے

مآلِ شکوۂ پیہم کہیں اُلٹا نہ ہو جائے ۔۔۔ بتِ بیگانہ خُواب اور بے پروا نہ ہو جائے

غرورِ ضبطِ غم یارب کہیں رسوا نہ ہو جائے ۔۔۔ فغانِ نیم شب افسانۂ فردا نہ ہو جائے

کہیں خود حسن کی دنیا تہ و بالا نہ ہو جائے ۔۔۔ سلامت ہے جنوں تو دیکھئے کیا کیا نہ ہو جائے

تجھے چشمِ فسوں پرور کہیں دھوکا نہ ہو جائے ۔۔۔ تموجِ سطحِ ساکن میں کوئی پیدا نہ ہو جائے

یہ حق کے نام سے باطل فروشی تا کجے واعظ ۔۔۔ ترے ہاتھوں کہیں یہ نام بھی رسوا نہ ہو جائے

اسی میں خیر ہے ساقی مے رنگیں پلائے جا
یہ بیکش ہوش میں آئے تو سمجھو تازہ ہو جائے

یہ برکھا رت یہ کیف آور سماں یہ مد بھری بوندیں
کہیں موجِ صبا خود جرعۂ صہبا نہ ہو جائے

یہ شوقِ چاکِ دامن کیا، یہ قید سیر صحرا کیوں
جنوں کیسا جو رسمیات سے بالا نہ ہو جائے

دلِ مضطر چلا تو ہے حریمِ حسن کو لیکن
حدیثِ شوق غرقِ شکوۂ بیجا نہ ہو جائے

دلِ وارستہ فطرت کو بہت مت چھیڑ اے ناصح
یہ دیوانہ کہیں گم گشتۂ صحرا نہ ہو جائے

مسافت دور کی ہے اور ساتھی تھکتے جاتے ہیں
کہیں منزل پہ میر کارواں تنہا نہ ہو جائے

بہت تنگ آچکا ہے دل ہجومِ نامرادی سے
یہ رندِ لم یزل اب مائلِ تقویٰ نہ ہو جائے

وفا کی آرزوان سے خبردار اے دلِ ناداں
یہ دردِ عشق بھی بازار کا سودا نہ ہو جائے

تمھاری بزم میں چپ بیٹھنا بھی تو قیامت ہے
خموشی سے کہیں خود رازِ دل افشا نہ ہو جائے

سہیلِ خستہ نقادانِ معنی اُٹھتے جاتے ہیں
ترا نغمہ بہارِ لالۂ صحرا نہ ہو جائے

قطعہ

از

حکیم الشعراء امجد حیدر آبادی

رکھتے ہو سمجھ تو رازِ فطرت سمجھو
اے حق طلبو! اپنی حقیقت سمجھو

اس غیر پسند نفس پر جور کرو،
جتنا ممکن ہو، آپ میں غور کرو

تم آپ ہو برق، طور کیوں جاتے ہو
تم خود ہو قریب دور کیوں جاتے ہو

رستہ ہے یہی کہ اپنے پیچھے ہو لو،
ہے لعل اسی میں اپنی گٹھری کھولو

کچھ عرش سے بھی پرے گذر جاتے ہیں
جس وقت ہم آپ میں اتر جاتے ہیں

بابُ التقریظ والانتقاد

علمائے ہند کی شاندار ماضی

(۵ حصے) مولفہ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء صوبہ آگرہ تقطیع چھوٹی ضخامت مجموعی ۹۲۲ صفحے،
کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت مرقوم نہیں، پتہ:۔ کتبخانہ فخریہ امروہہ گیٹ مرادآباد

تاریخ ہندوستان کے ہر دور میں ملک وملت کی خدمت اور مسلمانوں کی تجدید و اصلاح میں علمائے کرام کا بڑا حصہ رہا ہے، چنانچہ اسلامی دور سے لے کر اس وقت تک ہندوستان میں اسلامی حکومت یا مسلمانوں پر سیاسی، مذہبی یا اخلاقی جس حیثیت سے جب کوئی نازک وقت آیا تو علمائے کرام نے پوری قوت سے اس کا مقابلہ کیا، اور اگر ضرورت پڑی تو قلم کو چھوڑ کر تلوار بھی ہاتھ میں لی، ہندوستان میں سب سے پہلے اکبر نے اسلام کو مسخ اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی، اس کی تجدید و اصلاح کے لئے خدا نے حضرت مجدد الف ثانی کو پیدا کیا، جنھوں نے اکبر کے جانشینوں اور اس کے امراء کی اصلاح کر کے تیموری حکومت کو دوبارہ اسلامی حکومت بنایا، پھر اورنگ زیب کے بعد جب اس کے جانشینوں کی نا اہلی، نا اتفاقی، خانہ جنگی، ایرانیوں کے غلبہ، ان کی خود غرضی اور بیرونی قوتوں کی ریشہ دوانی سے تیموری حکومت پر سیاسی زوال آیا اور ایرانیوں کے اثرات وخیالات زیادہ پھیلنے لگے، اُس وقت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان و تلامذہ نے اپنے قلم و زبان سے اس کی اصلاح کی، جس پر ان کی تصانیف، مواعظ اور فتاوی شاہد

ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ کی متکلمانہ تصانیف میں مذہبی و اصلاحی مباحث کے ساتھ سیاسی نکتے اور
اقتصادی مسائل اسی ضعفِ سلطنت کے علاج کے لئے تھے، تیموری دور کے آخر تک اس خانوادہ
میں اصلاح و تجدید کا سلسلہ جاری رہا، تیموری سلطنت کے زوال کے بعد جب مسلمانوں کا سیاسی
وجود خطرہ میں پڑا، اور ان سے اسلامی روح رخصت ہوئی، اُس وقت اسی سلسلہ کے مجاہدین حضرت
مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید نے علمِ جہاد بلند کیا، پھر ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں بھی
علماء کا حصہ تھا جس کی سزا میں بہت سے مجاہدین قید و بند میں گرفتار اور جلاوطن ہوئے، اور
سولیوں کے تختوں پر چڑھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ ہی سے ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت
اور تعلیم و تہذیب کے پردہ میں ہندوستانیوں کی ذہنیت بدلنے کی کوشش جاری تھی، مسلمانوں
کو اس فتنہ سے بچانے کے لئے علمائے کرام نے تعلیم و ارشاد کے مدارس قائم کئے، مناظرے کئے،
ردِ عیسائیت میں کتابیں لکھیں، پھر تحریک آزادی کے ہر دور میں وہ پیش پیش رہے بلکہ درحقیقت
یہ راہ انہی کی دکھائی ہوئی ہے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی انقلابی کوشش سے لے کر اس وقت
تک ہندوستان کی سیاسی جنگ میں علماء کا جو حصہ رہا ہے وہ سب کی نگاہوں کے سامنے
ہے، لائق مولف نے ان تمام واقعات اور دیوبند کے سلسلہ کے مصلح و مجاہد علماء کے حالات
ان کے علمی، مذہبی اور اصلاحی خدمات اور مجاہدانہ کارناموں کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے گو
یہ معلومات اردو میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، ان تمام بزرگوں کے حالات اور کارناموں پر اردو
میں مستقل کتابیں ہیں، ان کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ خصوصاً دورِ آخر اور موجودہ دور کی
سیاسی تاریخوں اور متفرق مضامین میں یہ تمام حالات موجود ہیں، لائق مولف نے ان سب کو سلیقہ
و ترتیب کے ساتھ جمع کر کے ایک مسلسل تاریخ بنا دی ہے، علما کے مجاہدات کو موجودہ سیاسی مذاق
کے مطابق بنانے کے لئے سیاسی، اقتصادی اور اس نوع کے بعض دوسرے مسائل پر مصنف کے قلم سے

بھی اضافے ہیں، ظاہر ہے کہ اتنی وسیع کتاب میں واقعات میں نہ سہی، مولف کے نقطۂ نظر، مقدمات
اور نتائج میں اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہی، خصوصاً جہاں جہاں انھوں نے بعض اسلامی تعلیمات
اور علما کے مجاہدات کو ٹھیک ٹھیک اس دور کے سیاسی خیالات و نظریوں پر منطبق کرنے کی کوشش
کی ہے، لیکن اس مختصر تبصرہ میں اس پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کی گنجائش نہیں ہے، بعض تاریخی واقعات بھی
محلِ نظر ہیں، مثلاً حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے دعویٰ خلافت کو ملوکیت کے خلاف جنگ اور
ان کی خلافت کو خلافت راشدہ کے اصول پر بتانا صحیح نہیں ہے، یہ بھی خلافِ واقعہ ہے کہ بنی امیہ
کی ملوکیت کے مقابلہ میں صحابہ کے دل سے آزادی کے جذبات اس وقت تک ختم نہ ہوئے
جب تک بنی امیہ نے اکابر صحابہ میں سے ایک ایک کو دردناک عذاب دے کر قتل نہ کر دیا۔"
بلاشبہہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ ذاتی فضائل کے اعتبار سے اکثر اموی فرماں رواؤں سے بہتر تھے
لیکن ان کے دعویٰ خلافت کو جنگِ آزادی کے جذبہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، پھر معلوم نہیں انکی
خلافت کس لحاظ سے خلافت راشدہ کے اصول پر تھی، بہت سے اکابر صحابہ تو الگ رہے، کاش
لائق مولف نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے علاوہ چند ہی
ایسے صحابہ کے نام بتا دیئے ہوتے، جنھیں بنی امیہ نے حریت طلبی کے جرم میں قتل کیا ہو، بعض
اور مسائل اور واقعات بھی محلِ نظر ہیں، احادیث کی کتابت میں بعض بعض مقاموں میں غلطیاں
رہ گئی ہیں، لیکن ان خفیف مسامحات سے قطع نظر یہ کتاب دیوبند کے سلسلہ کے علما و مجاہدین
کے کارناموں پر اچھی کتاب ہے، اور جو معلومات بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد حاصل
ہوتے وہ تنہا اس کتاب سے حاصل ہو جاتے ہیں، اگر اس کتاب میں علمائے دیوبند کے ساتھ دوسرے
علمائے مجاہدین کے حالات بھی شامل کر دیئے جاتے تو زیادہ جامع ہو جاتی،

"م"

مطبوعاتِ جدیدہ

خمسۂ کیفی، از پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں۔ پتہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی۔

پنڈت برج موہن صاحب کیفی ہماری زبان کے ان صاحب کمال باقیات میں ہیں جن سے نسیم و سرشار کی یاد تازہ ہے، زیر نظر کتاب اس کا نمونہ ہے، اس میں دو نظمیں ہماری زبان اور ترقی اردو اور تین مضامین اردو ہماری زبان، اردو ولسانیات اور ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات ہیں، یہ تینوں مضمون بالترتیب اردو کانفرنس علی گڈھ، جامعہ عثمانیہ اور پٹنہ میں پڑھے گئے تھے، اور عرصہ ہوا شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں، ان مضامین میں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات، دونوں کی تہذیب و معاشرت اور ادب پر اس کے خوشگوار اثرات، اردو کی پیدائش، اس کے نام ہندی زبان اور ہندوؤں کے اس سے گوناگوں تعلق، اس پر ان کے اثرات، اردو زبان کی خصوصیات، اس کے ادبی ولسانی رموز و نکات وغیرہ کے متعلق مفید اور نکتہ ورانہ معلومات ہیں، یہ مضامین درحقیقت ان اعتراضوں کا جواب ہے، جو اردو کو ہندو سے بے تعلق بتانے اور ہندوستانی زبان سے خارج کرنے کے سلسلہ میں کئے جاتے ہیں، پنڈت جی نے ان میں تاریخی اور ادبی ولسانی دونوں پہلوؤں سے دکھایا، کہ ہر لحاظ سے اردو خالص ہندوستانی زبان ہے، اور اس کے بنانے میں ہندو مسلمان دونوں کا حصہ ہے، اس سلسلہ میں اردو زبان سے متعلق بہت سے مفید معلومات اور زبان وادب کے بہت سے نکتے معرضِ تحریر میں آ گئے ہیں، اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو ضرور اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے،

ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر، مولفہ جناب غلام یزدانی صاحب ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ حیدر آباد دکن ضخامت ۵۰ صفحے، کاغذ کتابت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

فاضل مولف نے اردو اکیڈمی جامعہ میں ہندوستان کے آثار قدیمہ پر یہ مقالہ پڑھا تھا، اس میں ہندوستان کے زمانہ ماقبل تاریخ سے چندر گپت کے زمانہ تک ہندوستان کی قوموں اور انکے تمدن پر آثار قدیمہ کی روشنی میں سرسری نظر ڈالی ہے، اور اشوک سے لے کر مغلوں تک ہندو اور اسلامی دونوں زمانوں کے ہر دور کے فن تعمیر عمارتوں، ان کی خصوصیات، ان پر مختلف قوموں کے اختلاط اور ان کے ذوقِ تعمیر کے اثرات اور عہد بعہد کے تغیرات و ترقی پر تبصرہ ہے، اس سے ہندوستان کے آثار قدیمہ کے تغیرات و ترقی کا نقشہ نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، فنِ تعمیر کی مناسبت سے لائق مولف کی تحریر میں جابجا آرٹ کی جھلک آگئی ہے،

محمد حسین آزاد، مولفہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ پتہ: ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد حیدر آباد دکن،

ہونہار مولفہ نے ایم اے کے امتحان کے لئے مولانا محمد حسین آزاد پر یہ قابل قدر مقالہ لکھا تھا جسے ادارہ ادبیات اردو نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس میں آزاد کے سوانح، ان کے علمی وادبی خدمات و کمالات اور ان کی تصانیف پر تبصرہ ہے، سوانح کے حصہ میں ان کے جو حالات تلاش و جستجو سے مل سکے ہیں جمع کر دیئے گئے ہیں، تبصرہ کے حصہ میں اُن کی ادب وانشاپر بڑی حد تک خوش مذاقی سے تبصرہ ہے، اگرچہ کہیں کہیں مبالغہ کا رنگ آگیا ہے جو غالباً آزاد کی تصانیف کے مطالعہ کا نتیجہ ہے آزاد کی سحر طرازی مسلم ہے، اس کے متعلق جتنا بھی لکھا جائے کم ہے، لیکن ان کے

تاریخی معیار، تنقیدی ذوق اور شاعری پر جو کچھ لکھا ہے، وہ ابھی خود لائق مولفہ کے لئے لائقِ غور ہے، ممکن ہے، جب آیندہ اُن کی نظر میں وسعت پیدا ہو ان کی یہ رائے بدل جائے آزاد کی تصانیف کے تاریخی و تحقیقی پہلو کے متعلق جو دلائل دیئے ہیں وہ یہ ہیں کہ مولانا حالی نے ان کی تاریخِ وفات کی نظم میں ان کی تحقیق کا اعتراف کیا ہے اور انھوں نے ایران جاکر فارسی زبان کی تحقیقات کی، ان دونوں دلیلوں کو تاریخی تحقیقات سے جو تعلق ہے وہ ظاہر ہے، آزاد ناقدِ شعر ضرور تھے، لیکن وہ خود کہاں تک شاعر تھے، یہ بحث طلب مسئلہ ہے، بلاشبہ اُنھوں نے اردو میں ادبی تنقید کی بنیاد ڈالی لیکن ان کی تنقید عموماً ان کے حسنِ عقیدت اور سوءِ ظن کی تابع ہوتی ہے، اور اسے بھی اکثر وہ انشاپردازی کے طلسم میں ایسا گم کر دیتے ہیں کہ ان کی رائے کا پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے، آزاد اور ان کے معاصرین کے موازنہ میں بھی مولفہ کا قلم جادۂ عدل سے ہٹ گیا ہے۔ ان پہلوؤں سے قطع نظر ہونہار مولفہ نے بڑے حسنِ مذاق اور سلیقہ سے یہ کتاب لکھی ہے، اور اس سے اردو میں آزاد کے متعلق ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا،

انجمن ترقی اردو کی کہانی، مولفہ جناب غلام ربانی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۴ر پتہ :۔ انجمن ترقی اُردو ہند نئی دہلی"

اس رسالہ میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے انجمن ترقی اردو کی تاریخ اور اسکی سرگذشت بیان کی گئی ہے کہ وہ کن حالات میں کن اغراض کے ماتحت قائم ہوئی تھی، ابتدائی دور میں اس نے کیا کام کئے اور اس پر کیسے کیسے نازک وقت آئے، پھر آخر میں مولوی عبدالحق صاحب کے ہاتھوں میں آنے کے بعد ان کی کوششوں سے اس میں کس طرح دوبارہ جان پڑی اور کتنی ترقی ہوئی اور رفتہ رفتہ اس کے دائرۂ عمل میں کتنی وسعت پیدا ہوئی، اس نے کیا کیا کام انجام دیئے اور آج وہ کس درجہ پر ہے، ہر دور کے عہدہ داروں اور ان کے مساعی کا بھی تذکرہ ہے، "م"